# آنسو

کتب خانہ
اثنا عشری (رجسٹرڈ) لاہور

# آنسو

## مُجاہدانِ کربلا کے خُونی افسانے

مصنّفہ

مرزا فدا حسین صاحب بی۔اے۔بی ٹی

ناشر

(رجسٹرڈ)

کُتب خانہ اثنا عشری لاہور

موچی دروازہ مُغل حویلی

بارِ دوم۔ تعداد ۱۰۰۰۔ قیمت مجلد عـہ

نوٹ:- ہر قسم کی مذہبی کتابیں بارعایت ملنے کا پتہ:- مینیجر امامیہ کتب خانہ لاہور ۔ مُغل حویلی

# فہرست

# نذر

اِس دلی عقیدت ۔ حقیقی محبّت اور غیر معمولی ارادت کے اظہار

کے لئے جو مجھے اہلبیت اطہار اور آئمۃ الطاہرینؑ سے ہے ۔

مَیں اِس تصنیف کو جو میرے جذباتِ دلی کی ۔ آئینہ دار ہے ۔

اُن بزرگوار ہستیوں کی خدمتِ اقدس میں نہایت ادب احترام

کے ساتھ بطورِ نذر پیش کرتا ہُوں ۔ جنہوں نے کربلا کی سنگلاخ

زمین پر تین دن کی بھوک پیاس میں دینِ حق کی ڈوبتی کشتی

کو کفر و الحاد کے تھپیڑوں سے بچانے کے لئے اپنی عزیز ترین

جانیں قربان کیں ۔

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

فدا

# دُعا

(۱)

اے خدا سینۂ مُسلم کو عطا ہو وہ گداز
تھا کبھی حمزہ و حیدر کا جو سرمایۂ ناز
پھر فضا میں تیری تکبیر کی گونجے آواز
پھر اِس انجام کو دے گرمئ عہدِ آغاز
نقشِ اسلام اُبھر جائے جلی ہو جائے
زندہ پھر عزمِ حسینؑ ابن علیؑ ہو جائے

(۲)

دشتِ اسلام کے کانٹوں کو گُلستاں کر دے
پھر ہمیں شیفتۂ جلوۂ ایماں کر دے

دل میں پیدا تپش بوذر و سلمان کر دے
اپنے محبوب کے صدقے میں مسلمان کر دے
حامل صبح شب تار کا سینہ ہو جائے
آبگینئے کو وہ چمکا کہ نگینہ ہو جائے

(۳)

دے ہمیں بار خدا جرأت و ہمت کے صفات
دل کو یوں چھیڑ کہ پھر جاگ اٹھیں محسوسات
پھر سے ہوں تازہ رسول مدنی کے غزوات
درس مومن کو یہ دے موت ہے تکمیل حیات
دشت پیماؤں کو چھوٹا ہوا صحرا دے دے
قیس کو پھر خلش ناقۂ لیلیٰ دے دے

(۴)

صبح اسلام پہ ہے تیرہ شبی کا پرتو
لب مسلم سے ہٹا تشنہ لبی کا پرتو
کانپ کر ماند ہو راحت طلبی کا پرتو
ڈال سینے میں رسول عربی کا پرتو
غل ہو وہ حوصلۂ شوق دوبارہ نکلا

وہ چمکتا ہوا اسلام کا تارہ نکلا

(۵)

زندہ کس طرح سے رہتے ہیں۔ بتا دے ہم کو
عقل حیران ہو وہ دیوانہ بنا دے ہم کو
سوئے میخانہ تعلیم صدا دے ہم کو
عشق کا ساغر لبریز پلا دے ہم کو
کج ہوں جس وقت سر حشر کلاہیں اپنی
جا ملیں ساقئ کوثر سے نگاہیں اپنی

---

# سیّد الاوصیاء

یعنی

## سوانح حیات جناب امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب

مصنفہ جناب مولانا مولوی عارف حسین صاحب قبلہ

اس میں جناب مولائے مومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام امام اوّل کی تمام زندگی از پیدائش تا شہادت کے حالات درج ہیں۔ قابل دید کتاب ہے۔
قیمت صرف ۲ہ؎۔ مجلد ولائیتی ڈائیدار سنہری چار روپے بارہ آنے
ملنے کا پتہ:۔ منیجر کتب خانہ اثناء عشری لاہور۔ مغل حویلی

مرزا فدا حسین بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔ (مصنف آنسو)

# تمہید

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

تیرہ سو سال گزر گئے۔ اِس خونی سانحہ کو۔ ایک نہیں۔ دو نہیں۔ پوری تیرہ صدیاں۔ اُس وقت آفتابِ اسلام کو گرہن لگا تھا۔ ماہ ایمان کو کُتے بھونکتے تھے۔ رسولِ خدا کا ایثار۔ علیؑ کی شجاعت، زہرہ کی غریب نوازی۔ ایک بھولا ہُوا افسانہ بن گئی تھی۔ وفات رسولِ مقبولؐ کے صرف نصف صدی بعد دُنیا کے دلدادہ دین کو ہڑپ کر جانا چاہتے تھے۔ کفر کی تاریکی شمعِ ایمان پر جھپٹ رہی تھی۔ اور فسق و فجور کی آندھیاں نُورِ حق کو بُجھانے پر تُلی ہوئی تھیں۔ اِسلام کے محافظ اور اُمتِ محمدؐ کے سربراہ کون تھے؟ تاریکی شب

ہیں.... نہیں.... روزِ روشن میں شراب کے جام اُنڈیلنے والے حرام و حلال کی تمیز اُٹھا دینے والے ٭

ہاں! اُس وقت کفر کا برہنہ رقص ہو رہا تھا۔ مگر کہاں؟ مسلمان کے خونچکاں اور مجروح دلوں کی لاشوں پر۔ زبانیں بند تھیں۔ دماغ سوچنے سے انکاری تھے۔ اور دِل کی دھڑکنیں خاموش تھیں۔ مبادا خلیفہ کی جنبش آبرو ہزارہا بندگانِ توحید کے قتلِ عام کا موجب نہ ہو جائے۔ روضۂ رسولؐ کے مجاور کی جان خطرہ میں تھی خانہ کعبہ کو غلاف کی بجائے شہزادہ مدنی کے خون کا لباس پہنایا جانے والا تھا۔ آنسو بہانا گناہ تھا۔ لیکن مسلمانوں کے دِل روتے تھے! ور سوچتے تھے۔ یاالہٰی۔ کیا تیرا دین اب لہو و لعب۔ رقص و سرود۔ اور فسق و فجور بن کر رہ جائے گا؟ اُس وقت.... ہاں اُس وقت ناموسِ رسولؐ کے تحفّظ کے لئے.... دینِ حق کو بچانے کے لئے.... مایوس و غمگین مومن کی تشفّی کے لئے ایک حسینؑ کی ضرورت تھی۔ اُس کی ضرورت تھی۔ جو ابراہیمؑ کے لختِ جگر کو بچانے کے لئے اپنا سب کچھ دے چکا تھا۔ اے جگر گوشۂ زہرہ؟ اُس وقت آپ میدان میں کود پڑے۔ پیری مانع تھی۔ ضعف مجبور کرتا تھا۔ یزید کی دولت و سلطنت اُس برقِ تپاں کی چمک رہی تھی۔ جو طیورِ چمن

محمدؐ کے نشیمن کو جلا دینے پر اُدھار کھائے بیٹھی تھی۔ لیکن جگر بندِ علیؑ کو زندگی کی کیا پرواہ۔ سبطِ رسولؐ کو موت کا کیا خوف۔ فاطمہؑ کے لعل کو لشکرِ کفار کا کیا ڈر۔ ہاشمی خون جوش میں آ گیا۔ خاندانِ ابی طالب کے نام لیوا کی رگِ حمیّت بھڑک اُٹھی کشتی نوحؑ کے بانکے کھیوٹ شوقِ شہادت کے چپو ہاتھ میں لئے نانا کی اُمت کے ڈوبنے والے سفینہ کو بچانے کے لئے آگے بڑھے۔ بنی اُمیہ کا لشکر سمندر کی طوفانی موجوں کی طرح حملہ آور ہو رہا تھا۔ لیکن دوشِ رسولؐ کے سوار نے اسلام کی نیّا کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ اور موجوں کو چیرتا ہوا صاف بچا لے گیا۔

لیکن۔۔۔ لیکن جب کالی کملی والے کی نیّا لبِ ساحل پہنچی۔ تو کشتی کے سوار رو اُٹھے۔ سینہ کوبی کی صدائیں اور غم انگیز نالوں کی گونج سے آسمان دہل اُٹھا۔ انسان وحیوان۔ طائر۔ جنّات فرشتے سب روئے۔ آنسوؤں کا سیلاب طوفانِ کفر پر غالب آ گیا۔ بحرِ حوادث کی طغیانی تھم گئی۔ مگر رسولؐ کا فرزند کہاں تھا۔ جسم مبارک کفر و الحاد کی چٹانوں اور فسق و فجور کی موجوں کے تھپیڑوں سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ اور زہرہؑ کے لعل کی رُوح پاک اپنے مرکز کی طرف۔۔۔ نانا رسولؐ اور باپ علیؑ سے بغلگیر ہونے

کے لئے جنّت فردوس کی طرف پرواز کر رہی تھی۔۔۔۔اس حالت میں کہ سینہ پر کڑیل جواں کی موت کا داغ تھا۔ اور ریشِ مبارک شیر خوار کے خون سے لبریز۔ سفینہ توحید کے مسافر رو اُٹھے۔ چلّا اُٹھے۔ بیک آواز پکار اُٹھے:۔

## آہ اِسلام کے محافظ

تیرہ سو سال سے یہی صدائے جگر خراش مادرِ گیتی کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ عرب و عجم کے صحراؤں۔ شام و فلسطین کی وادیوں ایران و عراق کے میدانوں ہسپانیہ کے مرغزاروں۔ حبش کے پہاڑوں اور ہندوستان کے سبزہ زاروں میں یہی بازگشت سُنائی دیتی ہے۔ دُنیا فرزندِ علیؑ کی شہادت کے غم انگیز سانحہ کو نہیں بھولتی۔ لوگ آج بھی حسینؑ کا ماتم کرتے ہیں۔ روتے ہیں۔ آنسو بہاتے ہیں۔ اور فرطِ جوشِ وقت سے اپنے جسم کو لہولہان کر لیتے ہیں*

* اسلام۔ جانِ لب اسلام پھر زندہ ہو گیا۔ لیکن اس کے لئے کتنی بڑی قُربانی دینی پڑی۔ رسولؐ کی رُوح پاک نے اپنے فرزند کو فاتح خیبر نے اپنے کلیجہ کے ٹکڑے کو اور خاتونِ جنّت نے اپنے جگر پارے کو خاک و خون میں لوٹتے دیکھا۔۔۔۔۔ دیکھا وہ خونین اور وحشت ناک منظر کہ لاشِ مظلوم پر گھوڑے دوڑ رہے ہیں

دیکھا کہ سید الشہدا کا سر مبارک یزید کی چھڑی سے ٹھکرایا جا رہا ہے۔ اِس پر بھی آسمان کا شامیانہ گر پڑا۔ زمین شق نہ ہو گئی۔ سمندر نے اِس گناہوں کی بستی کو اپنے پیٹ میں نہ چھپا لیا۔ کیوں؟ اِس لئے کہ شہید ابن شہید کی شہادت تجدیدِ اسلام تھی۔ حسینؑ کے خون کا زمین پر گرنا ایک پیش خیمہ تھا۔ عروجِ اسلام کا... اور نشان تھا اِس بات کا اب احکام خدا کو بدلنے والا کوئی نہیں +

ہمارے آقا و مولا حسین! دنیا جہان کے محسن اعظم حسینؑ! دین اسلام کے علمدار اور محافظ حسین! ذرا دیکھئے۔ ہماری آنکھوں میں کس کی تصویر پھرتی ہے۔ ہمارے سینوں پر کس کا اسم پاک کندہ ہے ہماری دلوں کی بے تابی کس کی یادِ اضطراب انگیز کی آئینہ دار ہے جگر گوشۂ زہرا۔ دنیا روتی ہے مسلمان ہی نہیں روتے۔ ساری دنیا روتی ہے آپ کی مظلومیت پر۔ مگر یہ رونا بھی باعث صد افتخار ہے کیونکہ آپ کی شہادت رنگ لائی! اور اسلام کی جڑیں تحت الثریٰ تک پہنچ گئیں۔ اور یزید... وہ سگِ دنیا جس نے امام دو جہان کو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سعی کی تھی۔ آج کہاں ہے۔ دنیا کہہ رہی ہے ”آوازِ سگاں کم نکند شانِ گدا“ حسینؑ زندہ ہے زندہ جاوید ہے اور رہے گا لیکن یزید پلید کی قبر کا نشان

بھی باقی نہیں۔ کوئی اس کا نام بھی نہیں لیتا۔ عرصہ دراز سے۔
تیرہ سو برسوں سے یہی صدا کانوں میں گونج رہی ہے،،
"ہائے حسینؑ! وائے حسینؑ!!

فدا

---

ٹریجڈی آف کربلا کی پیشنگوئی

# فدیۂ عظیم

باپ کا ہاتھ رُک گیا۔ جیسے کسی نے بزور پکڑ لیا ہے۔ چھری ابھی چلنے نہ پائی تھی کہ تھم گئی۔ رسّیوں میں بندھا ہُوا بیٹا گردن جھکائے منتظر تھا۔ کہ شہادت کا وقت سعید کب آتا ہے۔ لیکن اب ایسا محسوس ہُوا۔ گویا جامِ شہادت کسی نامعلوم طاقت نے اُس کے لبوں سے چھین لیا ہے۔ لیکن وہ خاموش تھا۔ زبان کلمۂ الٰہی کے ورد میں مصروف تھی۔ لب پر حرفِ سوال کیونکر لاتا۔

بزرگ باپ کے چہرہ پر اداسی جھلکنے لگی۔ وہ سوچتا تھا۔ کیا میری قربانی بارگاہ ایزدی میں منظور نہیں ہوئی۔ حکم ربّی یہ تھا۔ کہ میں اپنی عزیز ترین شے کی قربانی دوں۔ میرے خدا یقین کر مجھ پر

کہ مجھے اسمٰعیلؑ سے زیادہ اِس دُنیا میں کچھ بھی عزیز نہیں۔ پھر ہاتھ کیوں نہیں اُٹھتا۔ چھری کو کس نے پکڑ رکھا ہے۔ کیا مجھ پر محبّتِ پسر غالب آگئی ہے۔ نہیں۔ یہ بات تو نہیں۔ میرے دل کی دھڑکن تیز نہیں ہوئی۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے خالی ہیں۔ میرے سینہ سے آہِ سوزاں نہیں اُٹھتی۔ پھر یہ سکون۔ یہ جمود کیوں؟ اچھا! پھر کوشش کروں گا۔ ایک بار پھر گلوئے فرزند پر چھری چلاؤں گا اور دیکھوں گا۔ کہ کونسی طاقت اِس فریضہ کی ادائیگی میں میرے سدِّ راہ ہوتی ہے ۔

(۲)

حضرت ابراہیمؑ نے جس ہاتھ میں چھری تھام رکھی تھی۔ اُسے پھر بلند کیا۔ یہ کیا؟ چھری منوں وزنی۔ پتّھر کی طرح بھاری کیوں ہوگئی؟ ہاتھ کی قوت کس نے سلب کر لی؟ آہ! ابراہیمؑ۔ تیرا مالک تجھ پر خفا ہے۔ کارسازِ عالم تجھ سے برگشتہ ہے۔ آہ۔ میں کیا کروں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرطِ غم و غصّہ سے چھری کو زمین پر پٹک دیا۔ ہاتھ سے چھوٹنے اور زمین تک پہنچنے کے درمیانی وقفہ میں چھری کو قوتِ گویائی مل گئی اس نے کہا۔ "یا خلیل اللہ! مجھ پر یہ عتاب کیوں؟ یا خلیل اللہ تیری آرزو ہے۔ کہ میں اسمٰعیلؑ کو ذبح کر دوں اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ کہ میں تیرے حکم کی تعمیل سے انکار کر دوں۔ میں نے وہی کیا جو ربِّ جلیل کو

منظور تھا۔ اس میں میری خطا کیا ہے۔ جب تو خود اُس کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتا۔ تو میری کیا مجال کہ قہرِ خداوندی کو بیدار کروں"۔

حضرت ابراہیمؑ حیران رہ گئے۔ جس آسمانی طاقت نے زورِ بازو چھین لیا تھا۔ اُس نے اُنہیں قوّت گویائی سے بھی محروم کر دیا۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے۔ پلٹ کر چھری کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک ہی منظر پیش دید تھا۔ دیکھا۔ آنکھیں مل مل کر پتلیوں کو بقدرِ وُسعت پھیلا کر حواس کو مجتمع کر کے دیکھا۔ یہ خواب نہ تھا۔ واقعہ تھا۔ چھری زمین سنگلاخ کی بجائے ایک گوسفند پر گری تھی۔ اور اُس کا خون زمین پر بہہ کر خلیل اللہ کے قدم چوم رہا تھا۔

(۳)

حیرت زندہ پیغمبر نے دماغ پر بہتیرا زور دیا۔ لیکن عقل اِس معمّہ کو حل کرنے سے قاصر تھی۔ گوسفند کو اُٹھا کر بیٹے کی طرف گئے۔ دیکھا کہ اُس کے بند کھلے ہیں۔ رسّیاں ٹوٹ کر زمین پر جا پڑی ہیں۔ اور فرزند فرمانبردار دست بستہ کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے "بابا۔ آپ ادائے فرض سے قبل ہی مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ یہ غلام حکمِ پدر کی تعمیل کے لئے تیار ہے"۔

حضرت ابراہیمؑ رو دئیے اپنی مجبوری پر یا قاضی الحاجات کی

قُدرتِ کاملہ پر روئے اور اِس قدر روئے کہ ما فوقُ کا ہوش نہ رہا۔ غش کھا کر مٹنے کے لق و دق صحرا میں گر پڑے ✣

دفعتاً آسمان سے صدا آئی۔ سکوتِ فضا کو چیرتی ہوئی ماہ و انجم میں گونجتی ہوئی ہر چہار اطراف تھرتھراہٹ پیدا کرتی ہوئی بیہوش ابراہیمؑ نے گوشِ ہوش سے سُنا۔ اے خلیل مت رو اِس امر پر کہ تُو اپنے بیٹے کو راہ خدا میں قربان نہ کر سکا۔ میں نے اِس کا فدیہ ایک ذبحِ عظیم سے دے دیا ہے" ✣

حضرت ابراہیمؑ کو ہوش آ گیا۔ وہ عالمِ بیخودی خود فراموشی میں زمین کی طرف۔ آسمان کی طرف۔ شرق و غرب۔ شمال و جنوب ہر طرف دیکھنے لگے اُس ندائے غیبی نے سوال کیا "اے خلیل۔ بتا کیا تجھے میرا حبیب محمدؐ سب سے زیادہ عزیز نہیں ہے؟

پیغمبرؑ نے کہا "میرے مالک مجھے اس میں مجالِ انکار نہیں" ✣

پھر آواز آئی "اور اُس کی اولاد؟

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی اور کہا۔ "صاحب کون و مکان! اُن کی محبت کا دم نہ بھرنا کفر و الحاد میں شامل ہے" ✣

تو دیکھ۔

خلیل اللہ نے آسمان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا ✣

دیکھا۔ دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔
لب سے نالہ ہائے جانگداز نکل رہے تھے۔ سینہ سے آہوں کا دھواں
اُٹھ رہا تھا۔ نگاہ مجروح ہوئی جاتی تھی۔ کیسے نہ دیکھتے۔ یہ حکمِ الٰہی تھا۔
اور اس کی تعمیل سے انکار کون کر سکتا ہے؟

ہاں ابراہیمؑ نے دیکھا۔ تو آسمان پر سرزمین کربلا کا نقشہ نظر آیا۔
حسینؑ حق پرست تیروں کی بارش میں مصروفِ سجدہ تھے۔ اور اس کے
بعد دیکھا کہ فرات کے بالمقابل خون کی ندی بہہ رہی ہے۔ اور اس میں
مومنینِ بے گناہ کے لاشے بہے چلے جاتے تھے۔ علی اکبرؑ جیسا کڑیل
جوان کی لاش فراقِ پسر میں ماتم کناں ہے ... اور دیکھا کہ سقۂ سکینہ
بازو کٹوائے اور سر پاش پاش کرائے اوندھے منہ زمین پر پڑا
ہے ... ہاں دیکھا کہ علی اصغرؑ کی زبانِ خشک خونِ گلو سے سیراب
ہو رہی ہے۔ اور پھر ... دیکھا کہ سبطِ رسولؐ فخرِ کونین سردارِ شہدا
حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے کمسن بچے کے خون سے ریش مبارک
کو خضاب کئے گئے [illegible] بے رحمی [illegible] خون میں غلطیدہ ہیں۔
خاندانِ رسولؐ کی پردہ دار بیبیاں زلفِ عنبریں سے اپنے چہرے
چھپائے سینہ کوبی کر رہی ہیں ۔

خلیل اللہ اس منظرِ خونی کی تاب نہ لا سکے۔ اور پھر بیہوش ہو گئے *

یہ بشارت خلیل کا فدیۂ عظیم۔ اسمٰعیلؑ بچ گئے لیکن سبطِ رسولؐ نے جامِ شہادت پیا۔ دونوں میں سے برتر و بہتر کون تھا؟ اس کا فیصلہ قیامت کے روز وہی کرے گا۔ جس نے فدیۂ عظیم دیا *

---

# نواسۂ رسولؐ سے

اے شہیدِ کربلا اے راکبِ دوشِ نبیؐ
اے کہ مسلک تھا ترا حکمِ خدا کی پیروی
اے ازل سے سوزِ ملت جس کو قسمت میں ملا
سرزمینِ کربلا نے جس کو دامن میں لیا
حق پرستی میں اٹھائے تو نے صد رنج و الم
امتحانِ عشق میں بس تو رہا ثابت قدم
تشنگی میں جنگ میں تکلیف میں صابر رہا
آخری دم تک تہِ خنجر بھی تو شاکر رہا
تیری ہستی اسوۂ حسنہ کی اک تصویر ہے

تو جہاں میں خوابِ ابراہیمؑ کی تعبیر ہے
نخلِ ملت کے رگ و ریشہ میں تیرا خُون ہے
زندگی تیری سراسر سوز کا مضمون ہے
شکر و حلم و صبر و استقلال ہیں تیری صفات
سُورۂ اخلاص کی تفسیر ہے تیری حیات
زندگی تیری سراسر حُریت آموز ہے
اس کے ہر نغمہ میں تاثیرِ حیات افروز ہے
زندگی جاوداں را در شہادت یافتی!
خُونِ خود دادی بنائے تعمیرِ ملت ساختی!

---

# شہیدِ غربت

## (۱)

بی بی زینبؑ نے جھپٹ کر بھائی کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ اور اسے پڑھے بغیر بولیں۔۔۔ بھیا تمہیں سیّدہ عالم کے دُودھ کی قسم کُوفہ کا قصد نہ کرو۔ کُوفہ ہمیشہ بے وفاؤں کا شہر رہا ہے۔ جن لوگوں نے کبھی اپنے حاکموں سے وفا نہ کی۔ روایاتِ اسلام کا خیال نہ رکھا۔ خویش و بیگانہ کے ساتھ بامروّت پیش نہ آئے۔ وہ شہزادۂ کونین کے سگے نہیں ہو سکتے۔ فریب و دغا انہیں گھٹی میں ملا ہے۔ جانِ ہمشیر مجھے اہلِ کُوفہ کے خطوط سے خُون کی بُو آتی ہے۔۔۔۔ اوہ۔۔۔ مَیں انہیں نہیں پڑھوں گی۔ انہیں پھاڑ ڈالو۔ انہیں جلا دو۔ یہ بھول جاؤ۔ کہ کُوفہ نے

بھی سیدۂ عالم کے نورِ نظر کو بلایا تھا"

یہ کہتے کہتے حضرت زینبؑ رونے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان کی بات کا اثر ہوتے دیکھ کر آنسو بنت علیؑ کی امداد کے لیے آپہنچے ہیں۔ امام حسینؑ کچھ چپ رہے۔ پھر آہستہ سے بولے "بہن اس ایک خط کو تو پڑھو۔ پھر کچھ کہنا"

زینبؑ نے خط پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا:۔

امام عالیمقام!

قاصدوں کو پیام شوق دیتے دیتے زباں تھک گئی۔ نیاز نامے لکھتے لکھتے انگلیاں دکھنے لگیں۔ انتظارِ شہزادۂ کونین میں آنکھیں پتھرا گئیں۔ مگر ابھی تک حضور کا دیدار نصیب نہ ہوا۔ نہ ہمارے گوشِ دل اس مژدۂ خوش آیند سے بہرہ اندوز ہوئے۔ کہ حضور بہت جلد ہماری آتش شوق کو فرو کرنے اور دل کی جلن کو مٹانے کے لئے کوفہ میں رونق افروز ہوں گے۔ آخر یہ بے التفاتی کس لئے کیا ہم رسولؐ کی امت ہونے کے ناطہ اس کے مستحق بھی نہیں۔ کہ حضور ہماری جبینِ نیاز کو اپنی خاکِ پا کا تبرک عطا کر سکیں۔

جگر پارۂ رسولؐ۔ اگر آج شہنشاہ مدنی زندہ ہوتے۔ تو یقیناً حضور ہماری التجاؤں کو اس طرح ٹھکرا نہ دیتے۔ کیا آج ہم... آپ کے

نانا کے پرستار محض اس لئے شرابی و زانی حاکموں کے غلام بنے رہیں گے کہ حضور ہماری فریاد سننے سے قاصر ہیں۔ آہ کیا اُمّتِ محمدی صرف اِس لئے ایک بدقماش داد باش خلیفہ کے قدم چومنے کے لئے مجبور ہوگی کہ اس کا کوئی امام نہیں۔ قائد نہیں۔ ہادی نہیں ... نہیں .... ہے اور ضرور ہے۔ مگر وہ شمع ہدایت بن کر ہماری رہنمائی کے فرائض انجام دینے سے انکار کرتا ہے۔ شہزادۂ کونین۔ ہم نے تو فی سبیل اللہ جہاد کرنے کا تہیّہ کر لیا ہے۔ ہم طالب ہدایت و آمادۂ نُصرت ہیں۔ اگر آپ نہ آئے تو بھی ہم کُفر کا اقتدار مٹانے کے لئے اپنی جانیں لڑا دینگے۔ لیکن اگر ہمیں اِس کارِ نیک میں ناکامی ہوئی تو ..... کہتے ہوئے رنج ہوتا ہے ... کہ اس کا بارِ گُناہ حضور پر ہوگا۔ للّٰلہ ذرا غور تو کیجئے۔ کہ حضور سرورِ کونینؐ جنّت میں کتنے رنجیدہ ہونگے اور سیّدہ عالم کو کس قدر قلق ہوگا۔"

بی بی زینبؑ نے خط کے آخری دو جُملے بہ آوازِ بلند پڑھے۔ اور غش کھا کر گر پڑیں۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا۔ تو فرمانے لگیں .... آہ۔ ان ظالموں نے نانا رسول اور والدۂ فاطمۃ الزہرا کا ذکر کیوں کیا"

امام حسینؑ آہستگی سے بولے "بہن۔ اب کہو کیا کہتی ہو۔ نانا کی اُمّت مجھ سے طالبِ ہدایت ہے۔ میرا علم۔ میرا دماغ۔ میری عقل اللہ

کی دین ہے۔ کیا مظلوم و خوار مسلمانوں کو اُن کی مرضی کے خلاف ایک فاسق و فاجر کے ظلم کا شکار بننے کے لئے تنہا چھوڑ دوں۔ کوفہ مدد کے لئے پکار رہا ہے۔ کیا اپنے کان بند کر لوں۔ میری اچھی بہن۔ مجھ سے یہ نہیں ہونے کا۔ ذرا سوچو تو سہی۔ دُنیا کیا کہے گی۔ نانا رسول اللہ کیا کہیں گے۔ بابا علیؑ کیا کہیں گے۔ کیا خاتونِ جنت کبھی ہمیں معاف کر سکیں گی۔ نہیں۔ ہمیں جانا ہو گا۔ اللہ کے لئے رسولؐ کے لئے۔ دینِ محمدیؐ کے لئے"۔

(۲)

حضرت زینبؑ کی زبان بند ہو گئی۔ جب اہلِ کوفہ نے رسولؐ اور سیدۂ عالم کا واسطہ دے دیا۔ تو وہ کیا کہتیں۔ ہمراہیوں میں سے کسی کو بھی یہ جرأت نہ ہوئی۔ کہ امام ہمام کو قصدِ کوفہ سے روکے۔ مگر سب کے اصرار پر یہ فیصلہ ہوا۔ کہ پہلے مسلم بن عقیل کو ہانی بن ہانی اور سعید بن عبداللہ کے ہمراہ ایک خط دے کر کوفہ بھیجا جائے۔ اور جب بعد از تحقیقات اہلِ کوفہ کے ارادوں کی تصدیق ہو جائے۔ اُس وقت امام علیہ السلام کوفہ کا رُخ کریں۔ ورنہ راستے سے ہی کسی دوسری جگہ چلے جائیں۔ چنانچہ امام ہمام نے اِس مطلب کا ایک خط تحریر کر کے مسافرانِ کوفہ کے سپرد کیا۔

جُملہ مومنین و مسلمین کوفہ کے نام

تُم لوگوں کے پئے در پئے خطوط نے مجھے تڑپا دیا۔ یہ کیسے ممکن

ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ اُمّتِ رسولؐ کی مدد کرنے سے انکار کر دے۔ کبھی خواب میں بھی ایسا خیال دل میں نہ لانا۔ میں اپنے برادر عم زاد کو بھیجتا ہوں۔ اگر انہوں نے مجھے پیغام بھیجا۔ کہ تم سب آمادۂ نصرت ہو۔ اور جملہ اربابِ عقل تمہارے ساتھ ہیں۔ تو میں انشاءاللہ تعالےٰ بہت جلد تمہارے پاس پہنچوں گا۔"

حراولِ "مسلم" خدا کا نام اور امام ہمام کی دُعا لے کر چل پڑے منزل کٹھن تھی۔ اور راستہ دُشوار۔ راہ میں شدّت کی پیاس ایک رہبر کی موت کا باعث ہوئی۔ مُسلم کے دو نُورِ نظر محمد اور ابراہیم ہمراہ تھے۔ وہ بھی بہت بے چین ہوئے۔ مگر حراولِ حسینؑ کا قدم آگے ہی بڑھتا گیا۔ عقیل کے بیٹے نے قدم پیچھے ہٹانا نہ سیکھا تھا۔

مُسلم سے پہلے اُن کی آمد کی خبر کُوفہ پہنچی۔ بس پھر کیا تھا۔ لوگ اُن کی زیارت کو آنے لگے۔ تاریخ کہتی ہے کہ اٹھارہ ہزار کُوفیوں نے امامِ مظلوم کی بیعت آپ کے دستِ حق پرست پر کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ عقیدتِ رسولؐ اور حُبِّ امام کا ایک سمندر ہے۔ جو اہلِ کُوفہ کے دلوں میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ایمان کی ایک طغیانی ہے۔ جو خس و خاشاکِ کُفر کو بہالے جانا چاہتی ہے۔ ایک آگ ہے۔ جس نے سوائے عشقِ امام کے کسی کو باقی نہیں چھوڑا.... لیکن آہ۔ یہ

کون جانتا تھا۔ کہ چند سنہری رُوپہلی ٹھیکریوں کی چمک اس سمندر کو خشک کر دے گی۔ اس طغیانی بہاؤ کو روک دے گی۔ اس آگ کو ٹھنڈا کر دے گی۔ روپیہ دُنیا داروں کے لئے اچھی چیز ہے۔ مگر ایمان کا دشمن ہے ... جانی دشمن ... حضرت مسلم بن عقیل کو کیا معلوم کہ ایمان کی ان چنگاریوں میں کفر کی راکھ بھی پنہاں ہے۔ انہوں نے امام حسینؑ کو لکھ دیا۔ کہ مشتاقین کی رُوحیں عین انتظار میں استقبال کے لئے آنکھوں تک کھچ آئی ہے۔ تمام کوفہ آپ کی اطاعت کا دم بھرتا ہے۔ لہٰذا آپ فوراً تشریف لے آئیے۔ تاخیر نہ کیجئے۔ خود مسلم کو بھی معلوم نہ تھا۔ کہ یہ خط جو وہ امام ہمام کو لکھ رہے ہیں۔ دُنیا داروں کی اصطلاح میں موت کا وارنٹ ہے۔ اور امام ہمام کا پروانہ شہادت ٭

(۳)

اِدھر کوفہ کی چشم انتظار امام حسین علیہ السلام کی راہ دیکھ رہی تھی اور ہر لمحہ ان کے پہنچنے کی توقع تھی۔ اُدھر زمین و آسمان نے سیاہ لبادہ پہن لیا۔ اور رات کی تاریکی میں ایک نقاب پوش اپنے ہمراہیوں سمیت کوفہ میں داخل ہوا۔ لوگوں نے بیک زبان ہو کر "مرحبا! مرحبا! یا ابن رسول اللہ" کے نعرے بلند کئے ٭

مگر یہ کیا؟ نقاب پوش نے دارالامارہ کا رُخ کیوں کیا۔ اگر یہ امام

حسینؑ تھے۔ تو انہیں سب سے پہلے مُسلم بن عقیل سے ملنا چاہیئے تھا۔ نعمان بن بشیر حاکم کُوفہ کے پاس جانے کے کیا معنی؟ عوام کی ذہنیت عجیب و غریب ہوتی ہے۔ کسی نے کہدیا۔ وہ نعمان شیعۂ علی ہے! اور شاید شہزادہؑ کونین سب سے پہلے اُسی سے بیعت لینا چاہتے ہوں۔ اور یہ بات آناً فاناً پھیل گئی۔ لوگ بھاری تعداد میں نُصرت حسینؑ کے نعرے لگاتے نقاب پوش کے ساتھ ہو لئے۔ قلعہ کے متصل پہنچے۔ تو دیکھا۔ کہ صدر دروازہ بند ہے اور نعمان بن بشیر اسے کھولنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اسی اثنا میں ایک سوار گھوڑا دوڑا کر فصیل کے پاس گیا۔ اور بآواز بلند بولا یا ابن بشیر۔ شاہ یزید کے حُکم سے ابن زیاد حاکم بصرہ کُوفہ میں آیا ہے۔ اس لئے اگر تو قہر یزیدی کو دعوت نہیں دینا چاہتا۔ تو دروازہ کھول دے۔ اُسی وقت قلعہ کا دروازہ کھُل گیا۔ لوگ حیران رہ گئے۔ تاریکی میں انہوں نے ابن زیاد کو امام حسینؑ سمجھ لیا تھا۔ اور اپنے جوش و خروش سے دشمن پر یہ ظاہر کر دیا تھا۔ کہ وہ اس کے آقائے نامدار کے متعلق کچھ اچھی رائے نہیں رکھتے

(۴)

طلوع آفتاب کے ساتھ ہی کُوفہ میں ایک غیر معمولی انقلاب رُونما ہوا۔ جو کل امام حسینؑ کے نام کا ورد کر رہے تھے۔ وہ ابن زیاد کی اطاعت کا

دم بھرنے لگے۔ سیم و زر کی چمک نے کوفیوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی۔ جنہیں روپیہ مسخر نہ کر سکا۔ وہ قتل کی دھمکیوں کے آگے جھک گئے۔ ایک بار پھر کوفہ کفر نواز بنا۔ شام کو جب حسینؑ کے حراول نے نماز مغرب پڑھی۔ تو اس کے پیچھے صرف تیس ۳۰ نمازی نظر آتے تھے۔ اور عشا کے بعد تو سوائے دو چار کے کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کوفہ کا ایمان کفر کے بوجھ تلے دب چکا تھا۔

حضرت مسلمؑ نے جب یہ سنا۔ کہ اٹھارہ ہزار کی تعداد میں اُن کے ہاتھ پر امام ہمامؑ کی بیعت کرنے والے اپنے قول سے پھر گئے۔ اور اب وہی بنی ہاشم کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ تو اپنے میزبان مختار ثقفی کے مکان سے ان کی محلسرا میں چلے گئے۔ وہاں ابن زیاد کے ایک ہمراہی شریک ابن الاعور نے جو شیعہ علی تھا۔ ان سے کہا۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ اپنے بچوں کو لے کر کوفہ سے نکل جائیے۔ یہاں کا ذرہ ذرہ آپ کی جان کا لاگو ہو رہا ہے۔ اور ابن زیاد تو اسی لئے یہاں آیا ہے۔ کہ آپ کا سر کاٹ کر یزید کے پاس بھجوا دے۔ مسلمؑ وہاں سے اٹھے۔ اور ایک خاتون طوعہ کے مکان میں چھپے گئے۔ دوستوں کا خیال تھا۔ کہ مختار ثقفی کے ہاں رہنا خالی از خطرہ نہیں۔ اور مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا۔

(۵)

بزرگ مومنہ! تیرے مہمان کو موت کا بلاوا آ رہا ہے۔ اب اسے رخصت کر۔" حضرت مسلم نے نماز صبح کے بعد گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سن کر کہا:

بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر جن کے سینے رحم سے خالی ہوں۔ اور جن کے دل میں بغض و کینہ کی آگ جلتی ہو۔ وہ ایک سن رسیدہ عورت کے آنسوؤں کی قیمت کیا ڈال سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خونی شہسواروں نے حضرت مسلم کے ہاتھوں میں آہنی زیور پہنا دیئے۔ اور غریب الوطن پردیسی کو ابن زیاد کے پاس لے گئے۔ ابن زیاد کے سامنے پیش ہوئے۔ تو ایک مردِ مجاہد کی طرح سینہ تان کر کھڑے رہے ابن زیاد کے ایک خوشامدی نے شانۂ مبارک پر چٹکی لے کر کہا "مسلم خلیفۃ المسلمین کے جانشین و نمائندہ کو سلام کرو"

مسلم کی بھویں تن گئیں۔ انہوں نے غضب ناک ہو کر کہا "میں سلام کروں؟ کس کو؟ جو حامیٔ شیطان ہے۔ فسق و فجور کا مجسمہ ہے۔ اور ناحق کی امداد کے درپے ہے۔ انہیں جہاں رہے یا جائے۔ حرا دل حسین سے یہ نہ ہو سکے گا۔ اس کی جبین نیاز خاص آل عبا کے سوائے اور کسی کی آستان بوسی کی روادار نہیں"۔

ابن زیاد نے تڑپ کر میان سے تلوار نکال لی۔ اور بولا "تو خلیفۂ وقت کے نمائندہ کو سلام کرنے سے انکار کرتا ہے۔ تیری یہ ہمت؟"
مسلم بولے "زیاد کے بیٹے! مجھے آنکھیں کیا دکھاتا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ کہ تم لوگوں نے میرے لئے کیا سزا تجویز کر رکھی ہے۔ لیکن مجھے اپنی موت کا غم نہیں۔ یہی تو وہ معراج شہادت ہے۔ جس کے لئے ابن عقیل بن ابی طالب بطن مادر سے باہر آیا تھا"۔

ابن زیاد نے کڑک کر کہا "مسلم۔ زبان سنبھال۔ تیرے خلاف خلیفۂ وقت یزید کی حکومت و خلافت کے خلاف بغاوت پھیلانے کا الزام ہے"۔

مُسلم مُسکرائے اور بولے "بغاوت! کس کے خلاف! کیا اُس رذیل کے خلاف جس کے باپ نے دغا بازی سے وصیِ رسولؐ کی خلافت چھین لی۔ اور جو خود سوائے لہو و لعب کے اور کسی بات سے سروکار نہیں رکھتا"۔

ابن زیاد نے کہا "عقیل کے بیٹے! تیری زندگی کا قصہ پاک ہونے میں دیر نہیں۔ مگر پھر بھی گستاخی سے باز نہیں آتا۔ یہ تیرا تیسرا جرم ہے"۔
مُسلم نے استقلال سے جواب دیا "میرے جرائم کا فیصلہ یزید کی

قائم کردہ دُنیاوی عدالت ایسی نہیں۔ بلکہ اُس آسمانی عدالت کے رُوبرُو ہوگا۔ جس کے انصاف پر زانی و شرابی نام نہاد خُلفاء ہرگز اثر انداز نہیں ہو سکتے"۔

اس وقت ابن زیاد کے مُنہ سے جھاگ چھُوٹنے لگی۔ اُس نے بکر ابن عمران کو حکم دیا۔ کہ سقفِ بام پر لے جا کر مُسلم کا سر کاٹ لے اور جسم کو نیچے شارعِ عام پر پھینک دے۔

(۶)

آہ۔ کتنا دردانگیز نظارہ تھا۔ جس مسلم کے ہاتھ پر کل اٹھارہ ہزار ہاتھوں نے بیعت کی تھی۔ آج لاکھوں آنکھیں اُسی کی شہادت کا منظر دیکھنے کی مُشتاق تھیں۔ ایمان خُون کے آنسو رو رہا تھا۔ انسانیت اپنا گریباں پھاڑ رہی تھی۔ اور اخلاقِ حسنہ اہلِ کُوفہ کی انوکھی قُربانی کا ماتم کرنے میں مصروف ہیں۔ اُس وقت جلّادِ حراول حسین کو بام پر لے گئے۔

تلوار گردن پر چلنے کو تیار تھی۔ اور موت کا نقشہ پیشِ نظر۔ مسلم اس وقت ہنسے نہ روئے۔ صرف اتنا کہا۔ اے رسول اللہ کے بیٹے! میری آخری سلام قبول کرنا۔ آپ کا ایلچی اِس جہان سے جاتا ہے۔ اور زندہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہو کر یزیدی مظالم کی فریاد کریگا۔ اور قہر

خداوندی کو..... بیدار.....''

اُسی وقت جلاد نے تلوار کا وار کیا اور مُسلم کا دھڑ کٹ کر بام سے زمین پر آ رہا..... اہل کوفہ ہنستے تھے۔ابن زیاد قہقہے لگاتا تھا۔مگر بیکسی شہید غربت کے بے سر کے لاشے پر آنسو بہا رہی تھی ⁂

---

## لمعتہ الضیافی العمدۃ من اخبار الرضا دو حصّہ

اس میں روضہ اقدس جناب امام رضا علیہ السلام کے معتبر حالات درج ہیں۔ اور اسمائے گرامی شاہان و آں اصحاب کے جو روضہ مقدسہ سے فیض کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔اور جو معجزات ابتدا سے آجتک روضہ معتبرکہ سے ظاہر ہوئے ہیں اس میں اکثر لکھے گئے ہیں۔قیمت حصّہ اوّل ؏۔حصّہ دوم ؏

**امام مبین** } اس کتاب میں امام موسیٰ رضا علیہ السلام کے مختصر حالات درج ہیں۔قابل دید کتاب ہے۔قیمت صرف ۶ر

ملنے کا پتہ

**کتب خانہ اثناء عشری لاہور مغل حویلی**

# ایمان کی چنگاری

تم یقین نہ کرو گے۔ لیکن بعض اوقات آفتاب عالمتاب نصف شب کے پردہ تیرگی کو پھاڑ کر نکل آتا ہے۔ حُر یزیدی فوج کا ایک جرنیل تھا۔ جب وہ فوج کی ایک بہت بڑی جمعیت لے کر قصرِ بنی مقاتل کی طرف روانہ ہوا۔ تو اس کے چہرے پر یزیدی شیطنت کی سیاہی نمایاں تھی۔ لیکن اس کے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں آتشِ ایمان کا ایک شُعلہ چمک رہا تھا۔ خاک فسق و فجور میں دبا ہوا.... اور حاکمِ کوفہ کے وفادار جرنیل کو خود بھی اس کا علم نہ تھا۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانتا ہے *

مگر قصرِ بنی مقاتل تک پہنچتے پہنچتے اُس کی ذہنی کیفیت بدل گئی۔

کڑاکے کی دھوپ جھلسا دینے والی گرمی اور آسمان سے برسنے والی آگ نے اُس کے سرِ پُرغرور کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ جب وہ کوفہ سے چلا اُس وقت وہ پشتِ اسپ پر حوصلہ مندانہ انداز میں بیٹھا تھا۔ اب پیاس کے مارے اُس کی جان لبوں پر تھی۔ صرف اُسی کی نہیں.... اس کے رفقاء بھی بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبانیں پھیرتے اور اپنی قسمت کو روتے چلے جا رہے تھے۔

دُشمنانِ سبطِ رسول کا یہ قافلہ جب خیام آلِ نبیؐ کے پاس جا کر اُترا تو حُر ابن یزید ریاحی نے بڑھ کر امام برحق کے قدم چوم لئے اور التجا آمیز نگاہوں سے رُخِ پاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا.... رسولؐ اللہ کا واسطہ ہماری خطا معاف فرمائیے۔ ہم یزید کے نمکخوار سہی۔ لیکن پھر بھی مسلمان ہیں۔ کافر نہیں۔ آپ کے گھرانے سے عفو و ترحم کا رواج ہوا۔ ہماری تقصیروں پر خاک ڈالئے۔ ہماری اور ہمارے جانوروں کی تشنگی دور کیجئے۔ ہمیں تین پہر سے پانی کا ایک قطرہ بھی نصیب نہیں ہوا"۔

حضرت عباسؑ بول اُٹھے.... برادرِ محترم! یہ دشمن ہیں میرے اور آپ کے ہی نہیں۔ اسلام اور رسولؐ کے بھی۔ خونِ مُسلمؑ انہیں کے دوش پر ہے۔

مگر ساقیٔ کوثر کے فرزند سے دشمن کی مصیبت بھی دیکھی نہ گئی۔ جانتے تھے۔ کہ پانی پینے کے بعد یہ لوگ ہماری جان کے لاگو ہو جائینگے لیکن اس کے باوجود فرمانے لگے۔ بھائی عباسؑ! ہمارے دروازے سے آج تک کوئی سائل خالی نہیں گیا۔ کیا ہم پانی کی چند مشکوں کے لئے خاتون جناں کے جذبۂ مہمان نوازی و شوق غربا پروری کو ٹھیس پہنچا ئیں گے؟ نہیں نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا"

عباسؑ بولے حضور کا فرمان بجا۔ مگر عورتیں اور بچے! منزل کٹھن ہے دراستہ میں کوسوں تک پانی کا نام و نشان نہیں۔ جب پیاس سے بلبلاتے ہوئے بچے اپنی معصوم زبانیں ہونٹوں پر پھیر پھیر کر پانی طلب کرینگے۔ تو ہم انہیں کیا جواب دینگے؟"

فرزند رسولؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر انہیں ضبط کر کے بولے۔ اُن کا خدا حافظ ہے"۔ اب عباسؑ زیادہ پس و پیش نہ کر سکے۔ حکم کی دیری تھی۔ جانشین محمدؐ کا اشارہ پاتے ہی خدام اہلبیت اپنے ہاتھوں سے لشکر یزید اور اس کے جانوروں کو پانی پلانے لگے"

اُس رات حُرؑ کو نیند نہ آئی۔ وہ سوچتا تھا۔ ہم کتنے پست ہیں۔ کہ مہمانوں کو خود اپنے گھر بلا کر ذلیل کرتے ہیں۔ اور یہ کتنے بلند ہیں۔ کہ اپنے دشمنوں کی پیاس بھی نہیں دیکھ سکتے"

(۲)

دُوسرے دِن ایک اسپ سوار اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہُوا خیمۂ حُر میں داخل ہُوا۔ اور آداب بجالا کر بولا "حاکم کُوفہ کا حُکم ہے کہ حسینؑ کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ اور پابجولاں کُوفہ پہنچایا جائے"۔

حُر نے کہا۔ اچھا! ایسا ہی ہوگا۔ لیکن جب اس "اچھا" کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا۔ تو اس کا ضمیر اُسے ملامت کرنے لگا۔ اُسے اگلے روز کا واقعہ یاد آگیا۔ جب وہ پیاسا تھا۔ اور شہنشاہِ دوجہاں کے نواسے سے چند قطرات آب کی بھیک مانگی تھی۔ حُر کا جی چاہا۔ کہ اُلٹے پاؤں کُوفہ چلا جائے اور اپنی تلوار حاکم کُوفہ کے سامنے رکھ کر کہے "اب مجھ سے یزید کی چاکری نہیں ہو سکتی"۔ لیکن جذبۂ ایمانی ابھی اتنا طاقتور نہ ہُوا تھا حُکمِ حاکم کی تعمیل سے کوتاہی کے معنی تھے موت کو دعوت دینا۔ حُر خوف زدہ ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اُس کے دِل میں حق و باطل کی جنگ ہو رہی تھی۔

امام مظلومؑ نے جب یہ سُنا کہ حاکم کُوفہ نے ان کی گرفتاری کے احکام جاری کئے ہیں۔ تو حُر کو بلایا۔ اور اُس سے فرمایا۔ "میں یہ کیا سنتا ہوں"؟ حُر بہادر تھا۔ اُس نے بیسیوں معرکے سر کئے تھے۔ لیکن فقیرِ نینوا کا سوال سُن کر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بھرائی ہوئی آواز سے

بولا "میں ابن رسولؐ کے جسمِ مقدّس پر ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ لیکن مجبوری ہے۔ آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔ آپ کو میرے ہمراہ چلنا ہوگا"۔

کمزور انسان اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے ہمیشہ مجبوریوں کا سہارا لیا کرتا ہے۔ چند دن بعد حُر غازی بنا۔ آلِ رسولؐ کا جاں نثار بنا۔ مظلوم کربلا کا فدائی بنا۔ لیکن آج وہ کمزور تھا۔ اُس کے دل میں جذبۂ ایمان ابھی بیدار نہ ہُوا تھا... سو رہا تھا۔ ابدی نیند اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کبھی بیدار نہ ہوگا۔

## (۳)

آخر وہ دن بھی آیا۔ جس کے لئے سیدانیوں نے فرزندانِ رسولؐ کو اپنی چھاتیوں کا دُودھ پلا کر جوان کیا تھا۔ اور جس کے متعلق رسولؐ امام حسینؑ کے روز پیدائش ہی یہ بتا چکے تھے۔ کہ کربلا میں مُسلمانوں کے ہاتھ میری اولاد کے خُون سے رنگے جائیں گے۔

فدایانِ رسولؐ تین روز سے پیاسے تھے۔ وہ جنہوں نے لشکر یزید کو سیراب کیا تھا۔ خود ریگستان کی جلتی ہوئی ریت پر اپنی پیشانیاں رکھے خُدائے ذوالجلال کو سجدے کر رہے تھے۔ پیاس کے مارے جان لبوں پر تھی۔ مگر پیشانی پر شکن تھا نہ چہروں پر ملال۔

ابن سعد کے زیر کمان ایک جم غفیر فاطمہؑ کے لال اور اس کے اِنے "گنے" ساتھیوں کے مقابلہ میں سینہ پر کھڑا تھا۔ اور ملعون ابن سعد کی آواز لکھوکھا کانوں میں گونج رہی تھی:۔

بہادرو۔ یلغار کرو۔ اور اس وقت تک میدانِ جنگ سے قدم نہ ہٹاؤ۔ جب تک تمہارے سر کندھوں پر اندر رُوح جسم میں ہے اگر واپس آؤ۔ تو اس طرح کہ آگے حسینؑ کا سر نیزے پر نصب ہو۔ پیچھے پیچھے اٹھارہ بنی فاطمہؑ کے کٹے ہوئے سروں کا قافلہ نوکِ شمشیر پر سوار چلا آتا ہو اور آگ کے شعلے خاندانِ رسولؐ کی بی بیوں کو برہنہ سر اِدھر اُدھر بھاگنے پر مجبور کر رہے ہوں"۔

یہ آواز حُر نے بھی سُنی اور دوسروں نے بھی مُسلمان نام کے مسلمان تھے۔ ورنہ یزید کے اپنے لشکر میں سے کئی مائی کے لال امام ہمامؑ کی خاطر اپنا سر کٹانے کے لئے نکل آتے۔ اور اس طرح اپنے ذلیل اور کینہ توز کمان افسر کی اپیل کا جواب دیتے۔ مگر سب چُپ رہے۔ صرف حُر ایک ایسا شخص تھا۔ جس کے دل میں ابن سعد کے خلاف نفرتؔ حقارت کی آگ جل اُٹھی۔ نورِ ایمان کا شعلہ بلند ہُوا۔ اِس قدر بلند کہ حُر کے خوف اور کمزوری کی دیواریں کانپ کر گر گئیں۔ اُس کا بدن لرزنے لگا۔ کیا وہ محسن کُشی کے گناہ کا مُرتکب ہوگا؟ کیا فرزند رسُولؐ کے خُون سے

میرے ہاتھ بھی رنگین ہو نگے، لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ اس کا دل اُسے ملامت کر رہا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر خون و ملال کے آثار نمایاں تھے۔

ایک سپاہی نے اپنے جرنیل کا یہ حال دیکھا۔ تو پاس آکر بولا۔ "مرد غازی! کیا تم حسینؑ اور اس کے بہتّر ساتھیوں سے ڈر گئے؟ کبھی تمہاری ہیبت سے دشمنوں کا کلیجہ کانپ اُٹھتا تھا۔ آج سالار اعظم کی تقریر بھی تمہاری رگوں میں جوش نہیں پھونک سکی۔ آخر تم اتنے متردّد و متوحش کیوں ہو؟"

حُر نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ کچھ کہنے سُننے کا موقعہ نہ تھا۔ اس نے گھوڑا نہر فرات کی طرف بڑھایا۔ اور کچھ دُور جا کر اپنے فرزند کو آواز دی۔ دونوں میں کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن گفتگو ختم ہوئی۔ تو دونوں کے چہروں پر طمانیت برستی تھی۔ اور حُر کسی قدر بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔ بیٹا شہزادہ کونین کا خون اتنا ارزاں نہیں۔ کہ وہ نینوا کی اس سنگلاخ زمین پر بہنے لگے۔ اور ہم خاموش ہو رہیں۔

تاریکی میں روشنی پیدا ہو رہی تھی شعلۂ ایمان ایک بھبھوکے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ دونوں باپ بیٹا ایک طرف کو چل دئیے۔

(۴)

"بھائی عمرؑ تم کون ہو؟"

یہ الفاظ تھے جو امام ہمامؑ نے دونوں دفعہ نقاب پوشوں سے مخاطب ہو کر کہے۔ ایک کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اُس نے شہزادۂ رسالت کے قدم چُوم کر زار زار روتے ہوئے کہا۔ مَیں گنہگار ہوں۔ اور اس پر بار احسان سے اس قدر دبا ہُوا ہوں۔ کہ عفو تقصیر سے پہلے سر بلند نہیں کر سکتا"۔

عمرؑ اپنے کئے پر نادم تھا۔ امام علیہ السلام نے اُسے زمین سے اُٹھا کر سینہ سے لگا لیا۔ اور فرمایا میرے مہمان! حسینؑ تجھ پر قربان۔ مگر تُو ایسے وقت آیا ہے۔ جب حسینؑ کے پاس نانِ خُشک تو کُجا پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں جن مشکوں نے قصر بنی مقاتل میں تیری پیاس بجھائی تھی۔ وہ خشک ہو چکی ہیں۔ اب مَیں سوائے اس کے تیری کیا تواضع کر سکتا ہوں۔ کہ تیرے حق میں دُعائے خیر کروں۔ اور بارگاہِ عالی میں یہ التجا کروں۔ کہ خاتونؑ جناں کا آغوشِ مادری تیرے لئے وا ہو جائے"۔

حُر بیتابانہ حضورؑ کے قدموں میں لوٹ گیا اور بولا مجھے اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں۔ اگر خوانِ نعما یا شرابِ نایاب کی خواہش ہوتی۔ تو ان اشیاء کی یزید کے ہاں کمی نہ تھی۔ اب مجھے جام

شہادت درکار ہے۔ اور مَیں جانتا ہوں۔ کہ یہ نعمت مجھے سبطِ رسولؐ سے ہی مل سکتی ہے"۔

امام مظلوم آبدیدہ ہو گئے۔ اُنہیں ایک خوشی محسوس ہوئی۔ اِس لئے نہیں۔ کہ دشمن کا ایک بہادر جرنیل اُن کے ساتھ آ ملا ہے۔ بلکہ وہ بدیں وجہ مسرور تھے۔ کہ دُنیائے اسلام حق و ایمان کی خاطر مرنے والوں سے خالی نہیں ہو گئی۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے .... اور یہ خوشی کے آنسو تھے .... اُس خوشی کے جو ایک روحانی شہنشاہ کو ایک گنہگار کے گناہ سے توبہ کرنے پر ہوتی ہے۔

حُر برقِ تپاں کی مانند لشکرِ یزید پر گرا۔ اور اُس کے ساتھ اس کا نو عمر بیٹا بھی۔ وہ اس سے پہلے بھی بارہا جنگ آزما ہوئے۔ لیکن آج اُن کے حوصلوں کی بلندی اور اُن کی اُمنگوں کی پرواز۔ اب نئے جوش و خروش کا پتہ دیتی تھی۔ جن خوش نصیبوں کو شہزادہ کونین نے سب سے پہلے جنّت کا پروانہ راہداری دیا ہو۔ اگر اُن پر شجاعت مردانہ نثار نہ ہو تو اور کس پر ہو۔

حُر نے بہتوں کو تلوار کے گھاٹ اُتارا اور پھر آپ ابدی نیند سو گیا۔ اُس کے ساتھ ہی اُس کا بیٹا بھی گیا۔ مگر اِن دونوں کی شہادت نے دو اور حُر پیدا کر دیئے۔ حُر کا بھائی مصعب اور غلام عُروہ بھی شہادت گاہ

میں کود پڑے۔ اور سو پچاس کفّار کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر چل بسے.....
وہاں جہاں سردارِ دو عالم کا دستِ شفقت اپنی برکات ان پر نازل کرنے کے لئے بے قرار تھا۔

آج امام ہمام ہیں نہ اُن کی خاطر دولتِ یزید پر لات مارنے والے شہید۔ مگر اُن کا افسانہ بہانگ دہل دُنیا کو یہ بتا رہا ہے۔ کہ تاریکی میں روشنی بھی پیدا ہو سکتی ہے.... ہاں آفتابِ عالمتاب نصف شب کی تاریکی کو پھاڑ کر بھی باہر آ سکتا ہے۔ فسق و فجور کی آگ میں دبی ہوئی چنگاریاں بھی ایمان کی آگ روشن کر سکتی ہیں۔

---

# سُہاگ رات

وہ جوان تھا۔ عنفوانِ شباب کا مجسّمہ۔ اُس کے سڈول بازو بھرا ہُوا چہرہ فراخ سینہ بتا رہے تھے۔ کہ اُسے صحنِ طفلی سے گُلشنِ شباب میں قدم رکھے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ اُس کے ہاتھوں پر حنا کا رنگ اِس طرح کِھلا ہُوا تھا جُوں آسمان پر شفق پھُولی ہوئی ہو۔ وہ دُولہا تھا۔ جوانی اور شادی۔ جہاں اکٹھّی ہو جائیں۔ وہاں قُدرت کی تمام تر رعنائیاں ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں۔

اُس کا نام تھا وہب کون؟ حضرت امیرِ خیبر گیر کے محب عبد اللہ کا جگر بند۔ شادی کے بعد اپنی نوخیز دُلہن اور اپنی والدہ قمری کے ہمراہ گھر لُوٹ رہا تھا۔ اُس کا گُذر کربلا کے میدان سے ہُوا۔ اُس خُونی رزمگاہ

سے جہاں مسلمانوں کا ایک گروہ آلِ رسولؐ کی جان کا لاگو ہو رہا تھا۔ وہب کو چاروں طرف فوجوں کی شورش دکھائی دی۔ تو وہ ٹھہر گیا۔ اِس لق و دق صحرا میں فوجوں کا کیا کام؟ یقیناً یہ کسی جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ حقیقت حال معلوم کرنے میں اسے دیر نہ لگی *

کچھ دیر بعد وہ اپنی ماں سے کہہ رہا تھا۔ اماں۔ اہلبیتِ رسولؐ مصیبت میں ہیں۔ اغیار ان کے خون کے پیاسے ہیں۔ اور یہ فوجیں اِسی لئے جمع ہوئی ہیں۔ کہ حسین مظلومؑ اور دیگر اہلبیتؑ کو موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ ہمارے آقا کئی روز سے بھوکے پیاسے اس سنگلاخ زمین پر پڑے ہیں۔ جامِ شہادت پینے کے سوا اور کوئی راہِ فرار نہیں۔ اگر حکم ہو۔ تو میں بھی امام مظلومؑ پر قربان ہو جاؤں" *

سن رسیدہ قمری نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ بیٹا۔ ابھی تم نے اپنی دلہن کا منہ بھی نہیں دیکھا۔ کس منہ سے رزمگاہ میں جانے کے لئے کہوں۔ لیکن روکنا بھی میرے مقدور میں نہیں۔ تمہارا وجود حضرت علیؑ کی دعائے پاک کا نتیجہ ہے۔ اگر اُن کی برکت شامل حال نہ ہوتی۔ تو آج میری گود خالی ہوتی۔ جاؤ۔ لیکن ٹھیرو۔ میں بھی چلوں گی۔ اگر تم میدانِ جنگ میں جا کر شمشیر کے جوہر دکھاؤ گے۔ تو میں آلِ رسولؐ کی خدمت کر کے اپنی عاقبت سدھاروں گی" *

ماں بیٹا چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ تو نئی نویلی دُلہن بھی اُن کے پیچھے ہو لی۔ آج مسلمان لڑکیوں کو دُنیاوی عشرت سے محبت ہے لیکن جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے۔ اُس وقت دُختران اسلام دین محمدی کے لئے سر تک دے سکتی تھی۔ پھر شب کی دُلہن اپنے دُلہا کو قتل گاہ کربلا میں جانے سے کیونکر روکتی۔

تینوں مسافر چلے۔ اس سے پہلے اُن کی منزلِ مقصود زندگی تھی۔ دُنیا بھر کی مسرّتوں سے لبریز۔ اب کانٹا بدل گیا۔ وہ موت کی راہ پر جا رہے تھے۔ اس شاہراہ پر جو منزلِ شہادت سے گزُر کر جنّت کے دروازے تک جاتی ہے۔

(۲)

امام مظلومؑ قمری کی باتیں سُن کر رو پڑے۔ کتنا دلدوز نظارہ تھا ایک بڑھیا محبّت اہلبیت کے زیر اثر اپنے اکلوتے بیٹے کو شہید اور اپنی بہو کو بیوہ بنانے پر مُصر تھی۔ امام علیہ السلام ضبط نہ کر سکے انہوں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ بہن! مبارک ہیں وہ لوگ جو اسلام کے لئے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر جلتی ہوئی آگ میں کود پڑتے ہیں۔ تم اپنی بہو کو لے کر زینبؑ و ام لیلےٰ کے پاس جاؤ۔ تمہارا بہادر بیٹا اپنی تمام تر آرزوؤں ارمانوں اور امیدوں کے ساتھ اسلام پر قُربان ہو گا"۔

کہنے کو امامؑ نے یہ کہدیا۔ لیکن دِل کو یہ گوارا نہ ہُوا۔ کہ ایک دُولہا کو
جس کی دُلہن کے ہاتھوں سے ابھی حنا بھی نہیں اُتری۔ جس نے اپنی
رفیقۂ حیات کا چہرہ بھی نہیں دیکھا۔ اور جو بیوی کی محبت کا مزہ بھی چکھنے
نہیں پایا۔ دشمنوں کے ہاتھوں ذبح ہونے کے لئے بھیج دیں۔ قمری اور وہب
کی دُلہن حرم میں چلی گئی۔ وہب امامؑ کے حکم کا منتظر تھا۔ جب بہت
دیر گزر گئی۔ اور انہوں نے زبانِ مبارک سے کچھ نہ فرمایا۔ تو وہب
بولا۔ آقا میں شہادت کی آرزو میں آپ کے درِ دولت پر حاضر ہوا
ہُوں۔ آپ مجھے اجازت دینے میں تاخیر کر کے میری آرزوؤں پر
پانی کیوں پھیر رہے ہیں۔ خدارا جلدی کیجئے۔ اور مجھے حکم دیجئے کہ خاندان
رسولؐ کے دُشمنوں کا قلع قمع کروں۔ اور اس کارِ نیک میں اپنی زندگی
آلِ رسولؐ پر قربان کر دوں"۔

حضرت امامؑ کہاں تک تامل کرتے۔ انہوں نے آنسو بھری
آنکھوں کے ساتھ وہب کو جنگ میں جانے کی اجازت دیدی۔ وہب
گھوڑے پر سوار ہُوا۔ اور خوشی خوشی شہادت گاہ کی طرف روانہ ہُوا۔ امام
مظلومؑ ٹکٹکی لگا کر اُس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگے
جاؤ۔ خدا کی رحمتیں تم پر نازل ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ غروب آفتاب کے
وقت تمہاری لاش خاک و خون میں لوٹ رہی ہو گی۔ لیکن اسلام کے

جیالے بہادروں کو ایسی باتوں کی پرواہ نہیں ہوتی۔ جاؤ۔ خلوت گاہ کی بجائے میدان جنگ میں آج اپنی سہاگ رات منانا"۔

یہ کہتے کہتے امام مظلومؑ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

(۳)

وہب کی تلوار بجلی کی طرح چمکی اور دشمن کی صفوں کو گاجر مولی کی مانند کاٹنے لگی۔ یزیدی فوج میں بھاگڑ پڑ گئی۔ ایک شخص نے بھاگتے ہوئے کہا "اے نوجوان! کیا حسینؑ کے پاس کوئی اور بہادر نہ تھا۔ جو اس نے تجھ دولہا کو مرنے کے لئے لڑائی میں بھیجا"؟

وہب جوش محبتِ اسلام میں سرشار تھا۔ اس نے تلوار کا ہاتھ تولتے ہوئے کہا۔ خدا تمہیں غارت کرے۔ بزدلو! کیا راہ خدا میں لڑنا دولہا کا حق نہیں۔ یہی میری اصلی شادی ہے میں آج سہاگ رات منانے آیا ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس بانکے سپاہی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ یزیدی سپاہیوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہب کی بیجگری اور قربانی نے انہیں خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہب دشمنوں کو تلوار کے گھاٹ اتارتا اور غنیم کی صفوں کا چکر کاٹتا ہوا اس مقام پر آ پہنچا۔ جہاں اسکی ماں اور دلہن اس کی بہادری کا نظارہ دیکھ رہی تھیں۔ وہب نے ماں کے قدموں پہ سر رکھ کر کہا۔ اماں اب تو آپ خوش ہیں نہ"۔

قمری نے جو جواب دیا۔ اُسے سُن کر بیسویں صدی کی مائیں کہیں گی کہ اُس کے سینے میں پتھر کا دل تھا۔ نہیں۔ وہ بھی ماں تھی لیکن وہ سمجھتی تھی۔ کہ ابنِ رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے لئے اپنے بیٹے کو قربان کر دینا مہنگا سودا نہیں۔ اس نے کہا۔ بیٹا۔ میں اُس وقت خوش ہوں گی جب تمہارا سر آخری بوسہ کے لئے میری گود میں رکھا جائیگا"۔

وہب نے غنیم کی طرف دیکھا۔ اُس کے سپاہی بھاگ کر بہت دُور چلے گئے تھے۔ اُس وقت دُلہن نے اپنے رُخِ روشن سے نقاب اُٹھا دیا اور بولی آپ شہید ہونے جاتے ہیں۔ لیکن مجھ دُکھیا کو کس کے سہارے چھوڑ رہے ہیں"؟

یہ الفاظ نہ تھے تیر تھے۔ جو نوجوان دُولہا کے جگر کو زخمی کر گئے۔ کوئی اور ہوتا تو جنگ سے منہ موڑ لیتا۔ لیکن وہب نے کہا "دُلہن! خُدا اور رسولؐ تمہاری حفاظت کرے گا۔ بتاؤ۔ جس جنگ میں جن بیویوں کا سہاگ لُٹ گیا ہے ان کی مدد کون کرتا ہے۔ جن بچوں کو یزیدی بھیڑیوں کی تلواروں نے یتیم بنا دیا ہے۔ اُن کا باپ کون ہے؟ خُدا پر بھروسہ رکھو۔ اور مجھے آلِ محمدؐ پر اپنی جانِ حزیں نثار کرنے سے نہ روکو"۔

دُلہن کی نرگسی آنکھوں میں آنسوؤں کے تار نمودار ہوئے لیکن اُس نے ضبط کرتے ہوئے کہا "میری زندگی کے مالک! آپ نے

میرا مطلب نہیں سمجھا۔ میں آپ کے شوقِ شہادت پر قربان۔ میرا یہ منشا نہیں کہ آپ جنگ میں نہ جائیں۔ میں صرف امام مظلومؑ کی موجودگی میں آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں“۔

دُولہا نے اپنی عروسِ نَو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ پہلا اور آخری موقعہ تھا۔ جب وہب نے اپنی رفیقۂ حیات کو چھُوا۔ دونوں امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دُلہن نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”آقائے دوجہاں! میرے شوہر مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ مجھے اس دائمی مفارقت کا رنج نہیں۔ مگر میں آپ کو گواہ رکھ کر ان سے یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں۔ کہ جس طرح یہ میرا ہاتھ پکڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ اُسی طرح مجھ دُکھیا کو ساتھ لے کر بہشت میں داخل ہوں“۔

حضرت امامؑ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ انہوں نے گریہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا ”بیٹی! میں اس بات کا ضامن ہوں۔ کہ وہب تیرے ہمراہ بہشت میں داخل ہوگا“۔

ضعیف الاعتقاد لوگ سمجھیں گے۔ کہ وہب اور اُسکی دولہن کی آخری ملاقات تھی۔ نہیں! امام حسینؑ کی پیشینگوئی سولہ آنے درست ثابت ہوئی۔

(۴)

گھمسان کی جنگ ہونے لگی۔ وہب جدھر جھکتا۔ پرے کے پرے

صاف کر دیتا۔ چند منٹ میں اُس نے چالیس جوانوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ وہب تن تنہا ہونے پر بھی یزیدی لشکر پر بھاری تھا لیکن جس کی قسمت میں شہادت لکھی ہو۔ اُسے یہ اعزاز پانے سے کون روک سکتا ہے۔ وہ لڑ رہا تھا۔ کہ کوفے کے ایک سپاہی نے اُس کے دائیں ہاتھ پر وار کیا۔ اگر صرف دایاں ہاتھ ہی کٹتا۔ تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اُسی وقت وہب کا بایاں ہاتھ کٹ کر گر پڑا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ دشمن نے چالاکی سے اِس بہادر کو ناکارہ بنانے کے لئے یہ تدبیر کی تھی +

اب وہب کربلا کا دُولہا نہ تھا۔ بالکل بے دست و پا۔ دُولہن نے دُور سے شوہر کی یہ حالت دیکھی۔ تو وہ چُپ نہ رہ سکی۔ فوراً خیمہ کا ایک بانس لے کر گھمسان میں آکھڑی ہوئی۔ بیوی کی اِس دلیری پر وہب کی آنکھوں میں غرور کی چمک دکھائی دینے لگی۔ اُس نے دولہن سے پُوچھا۔ "تم میدانِ جنگ میں کیوں آئیں؟"

وہ بولی جس کا شوہر اپنی جانِ عزیز اسلام کی راہ میں قربان کر رہا ہو۔ وہ گھر میں خاموش کیسے بیٹھ سکتی ہے میں اِن ملعونوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی نسبت یہ بہتر سمجھتی ہوں۔ کہ رزمگاہ میں دشمنانِ آلِ عبا سے لڑتے ہوئے جان دے دوں۔ اور میرے آقا! کیا آپ کو وہ وعدہ یاد نہیں۔ جو آپ نے حضرت امام کو گواہ رکھ کر میرے ساتھ کیا تھا جب

آپ جنّت جا رہے ہیں۔ تو مجھے بھی ساتھ لے جائیے۔ مردِ مُسلم پر وعدہ ایفائی بھی فرض ہے۔ اور میں جانتی ہوں۔ کہ آپ عہد شکن نہیں ہو سکتے"۔

یہ کہتے کہتے دولہن نے بانس سے دشمن کے سر پھوڑنے شروع کر دئے۔ وہب اپاہج تھا لیکن اُسے ایسا معلوم ہُوا۔ گویا اُس کے کٹے ہوئے بازوؤں کی تمامتر طاقت اُس کی رفیقۂ حیات کے بازوؤں میں آگئی ہے۔ جامۂ عروسی پہنے۔ ہاتھوں میں مہندی رچائے دولہن کو جس شخص نے جنگ کرتے دیکھا وہ تھوڑی دیر کے لئے دِل تھام کر رہ گیا۔ حتّٰی کہ یزید کے بعض طرفدار بھی یہ کہنے لگے۔ کہ اگر نئی نویلی دولہنیں بھی حسینؑ کی امداد کے لئے رزمگاہ میں آسکتی ہیں۔ تو وہ فی الحقیقت حق پر ہیں۔

دولہن کی نظروں کے عین سامنے ایک ظالم نے وہب پر گُرز سے ایسا وار کیا۔ کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ گھوڑے سے نیچے آرہا۔ اور آنِ واحد میں ختم ہو گیا۔ شوہر کی شہادت کو دیکھ کر دولہن نے اپنا ہاتھ نہ روکا۔ وہ اَب بھی بدستور دشمن کی صفوں میں ہلچل مچا رہی تھی۔ اِس انتظار میں تھی کہ کوئی بُزدل عورت ذات پر ہاتھ اُٹھائے اور اُسے شوہر کے ہمراہ بہشت میں پہنچا دے۔

آخر اُس کی خواہش پُوری ہونے کا وقت آپہنچا شمر کے اشارہ پر

ایک شخص نے گرز مار کر عروسِ نَو کا سر پاش پاش کر دیا۔ اسلام کی مایہ ناز بیٹی آلِ واحد میں گر پڑی۔ وہاں جہاں اُس کا شوہر ابدی نیند سو رہا تھا۔ دونوں کے جسم سے بہتے ہوئے خُون کے فوارے مل گئے۔ دُولہا کا خُون دُولہن کے لہو کے ساتھ مِل کر بہہ رہا تھا۔ اور اُن کی لاشیں اِس طرح پڑی تھیں۔ گویا ایک دوسرے سے لپٹ رہے ہیں *

آفتاب غُروب ہو چکا تھا۔ دُنیا پر تاریکی آہستہ آہستہ اپنا تسلط جما رہی تھی۔ اور یہ دُولہا دُولہن اسی طرح کمخواب کے بچھونوں پر نہیں بلکہ کربلا کی سنگلاخ زمین پر لیٹے تھے *

یہ کربلا کے دُولہا کی سُہاگ رات تھی *

---

# بارہ امام

مؤلفہ سیّد احمد حسین صاحب ترمذی بی۔ اے (آنرز) بی۔ ٹی

اِس میں حضرت علی عالی مقام علیہ السلام سے لے کر حضرت امام مہدی آخر الزمان علیہ السلام تک کے حالاتِ زندگی مختصراً درج ہیں۔ گویا بارہ امام علیہم السلام کی سوانحعمری خصوصاً بچوں اور مستورات کیلئے عام فہم سلیس اُردو میں تالیف کی ہے۔ قابل دید کتاب ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ *

ملنے کا پتہ: منیجر کتب خانہ اثنا عشری لاہور مغل حویلی

# بُوڑھا غازی

صدیاں گزر گئیں ..... *

اُس وقت ہم سچّے مسلماں تھے۔ نمازیں آج بھی پڑھی جاتی ہیں شہیدِ کربلا کی مجالس اب بھی مُنعقد ہوتی ہیں۔ اور "یا حسین" کے نالے اس وقت بھی فضائے بسیط میں گونجتے ہیں لیکن آج ہماری مسلمانی میں حقیقت کم نظر آرہی ہے اور تصنع کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ہم میں بعض شہرت کے لئے اور بعض دولت کے لئے عشقِ حسینؑ کا دم بھرتے ہیں۔ لیکن اُن دنوں ..... آج سے تیرہ سو سال پیشتر ہمارا ظاہر باطن ایک تھا۔ خدمتِ دینی نمود و نمائش کے لئے نہیں۔ بلکہ خدمت کے خیال سے انجام پاتی تھی۔ یہ واقعہ اُسی زمانہ کا ہے۔ *

اُس وقت رسول مقبولؐ زندہ تھے۔ اور سایۂ رسالت میں شبر و شبیرؑ اُس دن کے لیۓ تیار ہو رہے تھے۔ جس نے اُنہیں دُنیا بھر کے انسانوں میں ممتاز بنا دیا۔ حبیب ابن مظاہر اور حسینؑ گھرنے دست تھے اکٹھے کھیلتے اکٹھے کھاتے اور اکٹھے سوتے دو قالب یکجان والا معاملہ تھا۔ حبیب کو تو حسین علیہ السلام سے اِس قدر محبت تھی۔ کہ دن میں پانچ دس مرتبہ دیدار نہ کر لیتے تو چین نہ آتا۔ لوگ کہتے تھے۔ کہ حبیب کو اللہ تعالےٰ نے حسینؑ کے لئے پیدا کیا ہے ؛

ایک روز کا ذکر ہے کہ حبیب کے باپ مظاہر نے رسولؐ اللہ کی دعوت کی۔ حسنؑ و حسینؑ بھی ہمراہ تشریف لانے والے تھے۔ جب مقدس مہمانوں کے ورود کا وقت قریب آیا۔ تو حبیب اپنے مکان کی چھت پر چڑھ گئے۔ تاکہ دُور سے جانِ رسالت کا دیدار کر سکیں انتظار میں ایک ایک گھڑی برس برس کے برابر گذر رہی تھی اشتیاقِ دید دل و دماغ پر کچھ ایسا غالب تھا۔ کہ بڑھتے بڑھتے چھت کے کنارے پر آ پہنچے۔ اور آنِ واحد میں زمین پر آ گرے۔ گرنا تھا۔ کہ طائر رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ والدین نے جب فرزند کی نعش دیکھی۔ تو سر پیٹ لیا لیکن دعوت رسولؐ کا وقت قریب آ رہا تھا اس لئے آہ و زاری میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دونوں نے صلاح کی۔ کہ

بیٹے کی نعش کو ایک کوٹھڑی میں رکھ دیں۔ اور جب رسول مقبولؐ اور اُن کے فرزند کھانا تناول فرما کر تشریف لے جائیں۔ تو حبیب کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا جائے۔ اولاد والو! یہ سطور پڑھو۔ اور اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ۔ کیا تمہارے دلوں میں اِس جذب کا عشرِ عشیر بھی موجود ہے؟ شاید نہیں۔ اِس لئے تو ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ آج مسلمان خُون دینے والے مجنوں نہیں رہے۔ دُودھ والے مجنوں بن گئے ہیں۔

رسولِ کریمؐ اور فاطمہؑ کے بیٹے دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ مظاہر کی بیوی نے انواع و اقسام کے کھانے چُن رکھے تھے۔ جب خوان پوش اُٹھایا گیا۔ تو مظاہر نے دست بستہ رسول اللہ سے عرض کی۔ "حضور اب کھانا تناول فرمائیں"

حضرتؐ تو خاموش رہے۔ لیکن حسینؑ فوراً بول اُٹھے۔ "چچا جان! حبیب کہاں ہے؟"

مظاہر کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ پیشانی پر پسینہ آگیا لیکن سنبھل کر بولے۔ کہیں باہر کھیلنے گیا ہوگا۔ ابھی آجائیگا۔ آپ بسم اللہ کریں!

لیکن شہزادہ کونین نے لقمہ توڑنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور بولے۔ "چچا۔ جب تک حبیب نہ آئیگا۔ میں ایک لُقمہ بھی نہیں کھا سکتا"

مظاہر نے ابنِ علی کو سمجھانے بہلانے اور بھرمانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اب بیچارہ مظاہر کیا کرتا وہ شاہِ مدنی کے قدموں میں گر پڑا۔ اور زار زار روتے ہوئے بولا۔ حبیب کو چھوڑ کر اگر یہ دُنیا کی کوئی چیز بھی مانگ لیں۔ تو مجھے انکار نہ ہوگا لیکن حبیب ....... آہ! اُسے حاضر کرنا میرے بس کی بات نہیں"۔

کیوں؟ حسینؑ عالیمقام نے پُوچھا:۔

مظاہر بولا۔ اس لئے ...... مگر زبان رُک گئی۔ مہمانوں کو کھانے پر بُلا کر مظاہر اُن سے یہ کیسے کہتا۔ کہ میرے فرزند کی لاش کوٹھڑی میں پڑی ہے۔

حسینؑ نے پھر پُوچھا۔ مگر وہ ہے کہاں؟

اب مظاہر سے ضبط نہ ہو سکا۔ انہوں نے اُنگلی سے اُس کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا جہاں حبیب دائمی نیند سو رہا تھا۔ حسینؑ کوٹھڑی کے اندر چلے گئے۔ اور پکارنے لگے حبیب بھائی حبیب بولتے کیوں نہیں؟ مگر کیا مُردے بھی بولتے ہیں؟

حبیبؐ اللہ نے جب یہ حالت دیکھی۔ تو فوراً دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے حسنؑ و حسینؑ نے آمین کہا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں حبیب بن مظاہر جیتا جاگتا اُٹھ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

طفولیت میں ہی جس بچہ کا شوق اُلفتِ حق اس قدر بڑھا ہوا ہو
اُس کی جوانی اور بڑھاپا کتنی بڑی قربانیوں سے مملو ہوگا۔ یہ بتانے کی
ضرورت نہیں ٭

(۲)

تقریباً پچاس سال بعد ......

حبیب ابن مظاہر گھر میں کھانے بیٹھے تھے۔ بچپن گزرا جوانی
تمام ہوئی۔ اب اُس پھول سے چہرے پر جھریاں نظر آتی تھیں۔ جنہیں
ایک سفید نورانی داڑھی چھپانے کی بے سود کوشش کر رہی تھی حبیب نے
دسترخوان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور لقمہ توڑ کر منہ میں رکھا لیکن ایسا
معلوم ہوا گویا معدہ بغاوت پر آمادہ ہے۔ روٹی حلق میں پھنسی جاتی تھی۔
انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا ٭

بیوی نے پوچھا۔ ہیں۔ آج اتنی جلدی اُٹھ گئے۔ کیا دشمنوں کی
طبیعت کچھ ناساز ہے؟

حبیب بولے۔ کیا بتاؤں۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ میرے آقا و مولا پر کوئی مصیبت آنے والی ہے" ٭

بیوی نے جواب دیا۔ آپ یوں ہی گھبرا رہے ہیں۔ مدینہ سے
ابن رسولؐ مکّہ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں خطرہ دیکھ کر کسی اور سمت

چلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ بالکل محفوظ ہیں۔ اور غالباً آپ جیسے کسی عقیدت مند کے ہاں یادِ حق میں دن گزار رہے ہونگے"۔

حبیب خاموش رہے بیوی کی بات میں وزن تھا۔ لیکن اِس بات کا کیا علاج کرتے کہ دِل ایک آنے والے خطرے کی پیشگوئی کر رہا تھا۔

جب انسان کی طبیعت مضمحل ہو۔ تو وہ دِل بہلاؤ کے لئے اپنی توجہ غیر ضروری باتوں پر مرکوز کر دیتا ہے۔ حبیب اُٹھے اور بولے۔ ذرا بازار ہو آؤں۔ کچھ خضاب خریدنے کا خیال ہے"۔

یہ کہہ کر وہ گھر سے چل دیئے۔ بازار میں ایک دوکان پر ٹھیرے اور خضاب خریدنے لگے۔ اِسی اثنا میں کسی نے پیچھے سے آ کر کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور بولا۔ یا ابن مظاہر۔ آپ خضاب خرید کر کیا کرینگے۔ میرے ساتھ چلئے اور اپنی ریش مبارک کو خُون سے خضاب فرمائیے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے آپ کو یاد فرمایا ہے"۔

حبیب دُکاندار سے خضاب کی پُڑیا لے چکے تھے۔ اجنبی کی بات سُنتے ہی پُڑیا ہاتھ سے گر پڑی۔ اور وہ گھبرا کر پُوچھنے لگے۔ میرے آقا و مولا کہاں ہیں۔ اور کس حال میں ہیں۔ خُدا کے لئے جلدی بتاؤ۔ اور یہ بھی کہو کہ تم کون ہو؟"

اجنبی نے اپنے حزن و ملال کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
علیؑ کے لختِ جگر آج صحرائے کربلا کی خاک چھان رہے تھے۔ کوفہ والوں نے
آپ کو دھوکے سے اپنے ہاں بلایا۔ اور جب آپ میدانِ کربلا پہنچے۔
تو یزید کا لشکر آپ کے قتل کے لئے آموجود ہوا۔ جب یزیدی پہلوان اکٹھے
ہو رہے تھے۔ تو جناب زینبؑ نے سرکار سے عرض کی۔ بھیا ابن زیاد شام
کے بہترین شجاعوں کو جمع کر رہا ہے۔ آپ اپنے مجاہدین کو بلوائیے۔ اس پر
ابن رسولؐ نے فرمایا۔ ہاں جانی۔ کس کو بلاؤں۔ ایک حبیب کے سوا
اور کوئی نظر نہیں آتا۔ جس سے امداد کی التجا کروں۔ مگر وہ بوڑھا ہو چکا
اور شاید تلوار بھی نہ اٹھا سکے۔"

"بس بس" حبیب پکار اٹھے۔ آقا نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ جو
اس موقعہ پر یاد فرمایا۔ ورنہ شہادت کی حسرت دل ہی میں رہ جاتی۔
میں بوڑھا ہوں۔ میری قوت سلب ہو چکی ہے۔ تلوار اٹھاتے ہی ہاتھوں
میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ کہ اگر خدمت حسینؑ کا شرف
میری قسمت میں نہ ہوتا۔ تو میں کبھی کا مر چکا ہوتا۔ میں جاؤں گا۔ بنی فاطمہؑ
کے قاصد۔ میں امام عالیمقام کی قدمبوسی کرنے جاؤں گا۔"

قاصد حبیب کا جواب سُن کر حیرت زدہ ہو گیا۔ اُسے کیا معلوم کہ حبیب
کس لئے اس دنیا میں آئے تھے۔ اُسے کیا خبر کہ اُن کا مرنا جینا حسینؑ کے

لیئے تھا ؟

بُوڑھے غازی نے گھر آ کر اپنی زنگ آلودہ تلوار صاف کی اور بیوی سے بولا۔ الوداع اب جنت میں ملیں گے"۔

تھوڑی دیر بعد کربلا جانے والا راستہ تیز گام گھوڑوں کے ٹاپوں سے گرد آلودہ ہو رہا تھا۔

(۳)

رات کا وقت تھا حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے خیمے کے باہر کھڑے تھے۔ کہ ایک شہسوار اُن کے پاس آ کر گھوڑے سے اُتر پڑا۔ اور آپ کے قدموں میں گر کر آپ کے پائے مبارک کو اپنی ڈاڑھی سے صاف کرنے لگا۔ فرزندِ رسولؐ نے پُوچھا۔ تم کون ہو۔ بھائیؑ ؟

نووارد نے کہا۔ سرکار نے غلام کو نہیں پہچانا۔

تاریکی میں جو کام آنکھیں نہ کر سکتی تھیں۔ وہ کانوں نے کر دیا حسینؑ نے اُسے دونوں ہاتھوں سے اُوپر اُٹھایا اور سینہ سے لپٹا کر بولے۔ حبیب میرے حبیب۔ مظاہر کے بیٹے۔ تم آ گئے!"

حضور کی مصیبت سُن کر میں گھر میں کیسے رہ سکتا تھا۔ لیکن اب تم بُوڑھے ہو گئے لڑو گے کیونکر ؟

غلام نے بچپن اور جوانی حضور پر نچھاور کر دی ہیں۔ کیا اب حضور بُڑھاپے کی

اجنبی نے اپنے حزن و ملال کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ علیؑ کے لختِ جگر آج صحرائے کربلا کی خاک چھان رہے تھے۔ کوفہ والوں نے آپ کو دھوکے سے اپنے ہاں بلایا۔ اور جب آپ میدانِ کربلا پہنچے تو یزید کا لشکر آپ کے قتل کے لئے آموجود ہوا۔ جب یزیدی پہلوان اکٹھے ہو رہے تھے۔ تو جناب زینبؑ نے سرکار سے عرض کی۔ بھیّا ابن زیاد شام کے بہترین شجاعوں کو جمع کر رہا ہے۔ آپ اپنے مجاہدین کو بلوائیے۔ اس پر ابن رسولؐ نے فرمایا۔ ماں جائی۔ کس کو بلاؤں۔ ایک حبیب کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا جس سے امداد کی التجا کروں۔ مگر وہ بوڑھا ہو چکا اور شاید تلوار بھی نہ اٹھا سکے "

"بس بس" حبیب پکار اٹھے۔ آقا نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ جو اس موقعہ پر یاد فرمالیا۔ ورنہ شہادت کی حسرت دل ہی میں رہ جاتی۔ میں بوڑھا ہوں۔ میری قوت سلب ہو چکی ہے۔ تلوار تھامتے ہی ہاتھوں میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن مجھے یقین ہے۔ کہ اگر خدمت حسینؑ کا شرف میری قسمت میں نہ ہوتا۔ تو میں کبھی کا مر چکا ہوتا۔ میں جاؤنگا۔ بنی فاطمہؑ کے قاصد۔ میں امام عالیمقام کی قدمبوسی کرنے جاؤنگا"

قاصد حبیب کا جواب سن کر حیرت زدہ ہو گیا۔ اسے کیا معلوم کہ حبیب کس لئے اس دنیا میں آئے تھے۔ اسے کیا خبر کہ ان کا مرنا جینا حسینؑ کے

زہرہ کے لال نے اپنے صحابی سے فرمایا۔ ابو ثمامہ! تم نے کیسے نازک وقت میں نماز کو یاد کیا ہے۔ خدا کی رحمتیں تم پر نازل ہوں۔ جاؤ ابن شقی القلب ملاعنہ سے کہدو۔ کہ اب ہاتھ روک لیں اور ہمیں نماز پڑھنے کی مہلت دیں ٭

(۴)

حسینؑ کے جاں نثار غازی نے دشمن کی صفوں کے قریب پہنچ کر دایاں ہاتھ بلند کیا۔ اور پکار کر کہا۔ اسلام کے نام پر اور رسول اللہ کے نام پر جس نے ہر مسلمان کے لئے نماز لازمی قرار دی ہے۔ شاہ مدنی کا فرزند حسینؑ نماز ظہر کے لئے مہلت مانگتا ہے ٭

یزیدی بھیڑیوں نے جب یہ کلام سنا۔ تو دانت نکالنے لگے۔ ابن نمیر بولا خواہ کتنی ہی نمازیں پڑھو۔ تمہاری نماز قبول نہیں ہو گی ٭

ابو ثمامہ مایوس واپس آ گئے لیکن حبیب ابن مظاہر جنہوں نے ابن نمیر ملعون کا گستاخانہ جواب سن لیا تھا۔ زخمی شیر کی طرح بپھر گئے۔ اور شہزادۂ کونین کے قدموں پر گر کر بولے۔ مولا میرے کان ایسا سخت کلام سننے کے عادی نہیں۔ دل وہ داغ ہے کہ آتش غضب سے پھنکا جاتا ہے۔ اجازت دیجئے کہ ابن نمیر کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں۔ آپ نماز پڑھئے میں جنت میں جا کر حضور کے نانا کے پیچھے پڑھ لونگا ٭

حسینؑ آبدیدہ ہوکر بولے۔ بھائی حبیب اِس بڑھاپے میں مرنے
کے لئے دشمن کے مقابل نہ جاؤ۔ لوگ کہیں گے۔ کہ حسینؑ نے اپنے جوان
بچوں کے ہوتے ایک کہن سال ہمجولی کو موت کے مُنہ بھیج دیا۔

حبیب نے عرض کی۔ امام عالی مقام جو ایسا کہیگا۔ میں اُس کی بھی
زبان کاٹ لونگا۔ لیکن مجھ سے ابن رسولؐ کی یہ توہین دیکھی نہیں جاتی۔
غضب خدا کا۔ ان ملاعنہ کی نماز تو قبول ہو اور ہمارے متعلق یہ کہیں۔
کہ ان کی نماز بارگاہِ عالی میں قبول نہ ہوگی۔

امام برحق سے اجازت ملتے ہی حبیبؑ گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر
اشقیا کے مقابل گئے ہونٹ فرطِ غضب سے کانپ رہے تھے رجز کرتے
ہوئے بڑھے انہوں نے صرف اتنا کہا۔ ملعونو! تیار ہوجاؤ، فرزند
شاہ نجف کا غلام امام برحق کا جاں نثار اور کلمۃ الحق کا شاہد آپہنچا۔

بوڑھے غازی نے ان الفاظ کے ساتھ غنیم پر حملہ کر دیا۔ وہ ہاتھ
جو بوجہ پیری لرزہ براندام رہتے تھے۔ آج پھرتی سے تلوار چلا رہے تھے۔
ایسا معلوم ہوتا گویا حبیب کی جوانی عود کر آئی ہے۔ ساٹھ بے دینوں
کو تہ تیغ کرنے کے بعد کہن سال مجاہد کی نگاہیں ابن نمیر کی جستجو کرنے لگیں۔
جس کی بدکلامی نے اُس کے دل و جگر کو چیر کر رکھ دیا تھا۔ جب اُس کے
پاس پہنچے۔ تو حبیب نے للکار کر کہا او ولدالحرام ٹھہر! یہ کہہ کر فرزند

رسولؐ کی نماز قبول نہ ہوگی"۔

یہ کہتے ہی بوڑھے غازی نے تیزی سے حملہ کیا۔ ابن نمیر کی جان بچ گئی۔ لیکن ناک بھٹّہ سی اڑ گئی۔ اور وہ ناک کٹا کر نوک دم بھاگا۔ بوڑھے غازی نے اُس کا تعاقب کیا۔ لیکن اُسی وقت ایک مردُود نے عقب سے تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا۔ کہ حبیب ابن مظاہر زمین پر گر پڑے۔ اور گرتے ہی اُن کے مُنہ سے نکلا۔ یا مولاہ اَدرِکنی۔

مظلُوم کربلا نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ فوراً اُس طرف دوڑے جہاں آپ کا بچپن کا رفیق دم توڑ رہا تھا۔ امام مظلومؑ نے اس کی یہ حالت دیکھی۔ تو تڑپ اُٹھے اور بولے۔ حسینؑ کو نرغۂ اعداء میں چھوڑ کر کہاں چلے؟ حبیب.... بُوڑھے غازی نے اپنا سر قدمِ مبارک پر رکھ دیا۔ ایک آہ لی اور بس۔

# سُہاگ کی قُربانی

## (۱)

زہیر ابن قین اِن لوگوں میں سے نہ تھے۔ جو اپنی بُزدلی کو چھپانے کے لئے تدبیر اور مصلحت پسندی کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ اُن کے دل میں نُورِ عین رسول اور اہلبیت علیہم السلام کے لئے حقیقی محبّت تھی ..... محبّت بھی وہ جو اپنے محبوب پر سب کچھ قُربان کر سکتی ہے۔ یہی محبت انہیں ابن علی کے پیچھے پیچھے مکّہ سے دشت و صحرا میں لے آئی تھی۔ زہیر اسلام کے فدائی تھے۔ اور کردار کے غازی لیکن اسے تقاضائے عمر سمجھو یا کمالِ دُور اندیشی۔ کہ ہر قدم کافی غور و خوض کے بعد اُٹھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جہاں دیگر انصاران حسینؑ فرزند رسولؐ کے ہمراہ عازمِ کوفہ

ہوئے۔ وہاں محتاط زہیر نے کاروانِ شہداء سے کسی قدر پیچھے رہنا بہتر سمجھا۔ کیوں؟ اِس لئے کہ بنی امیہؓ پر ابھی کوفہ کے جلیل القدر بزرگ اور قبیلہ بنی تغلبیہ کے سردارِ اعظم کی دلی کیفیت آشکار نہ ہو جائے۔ اور مُفت میں خُونریزی نہ ہو۔

ان کا قافلہ نہایت مختصر تھا۔ ایک زوجہ اور چند رُفقاء قدیمی جن سے اخفائے راز کا کوئی اندیشہ نہ کر سکتا تھا۔ منزلِ حزیمیہ پر پہنچ کر کاروانِ زہیر نے ڈیرے ڈال دئیے۔ اور طعام کا اہتمام ہونے لگا۔ ابھی دستر خوان بچھا ہی تھا۔ کہ دُور سے ایک شُتر سوار آتا دکھائی دیا۔ زہیر سوچنے لگا۔ ہو نہ ہو یہ شہزادۂ کونین ہی کا قاصد ہے۔ فوراً کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ اور مضطربانہ انداز میں اجنبی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ قاصد نے آتے ہی ایک خط اُن کے ہاتھ میں دیا۔ یہ خط فاطمہ کے نُورِ نظر کا تھا۔ زہیر پڑھتے تھے۔ اور مارے جوش کے اُن کا چہرہ سُرخ ہوتا جاتا تھا۔ ہمراہیوں کو سُنانے کے لئے انہوں نے یہ ذرا بآوازِ بلند پڑھا:۔

قین کے جوانمرد شیر!

میرا علم کہتا ہے کہ مشیت الٰہی جاری ہو چکی۔ محرّم کا مہینہ آرہا ہے اس کی دس تاریخ کو ہم اس عہد کا آخری فریضہ پڑھیں گے! اور اس کے

بعد خونِ آلِ محمدؐ یزید پلید کے سر ہوگا۔ اب تک تم پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔
لیکن اب ہمارے ساتھ آ ملو کہ روزِ شہادت قریب ہے اور تم ابنِ مرتضےٰ
کے محضرِ شہادت پر اپنے خون سے دستخط کر چکے ہو ؏

تمہارا حسینؑ ابن علیؑ

یہ خط بھی تھا اور پیشینگوئی بھی۔ زہیر کے ہمراہیوں نے امام عالیمقام
کا پیغام سُنا۔ تو اُن کے دِل لرز گئے۔ موت سامنے کھڑی تھی۔ اور وہ
خوفِ جاں سے کانپ رہے تھے۔ زہیر نے سب کی طرف دیکھا۔ اُن کی
نگاہ اپنے اہلِ قبیلہ کی دلی کیفیّت کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہمراہیوں کی
یہ حالت دیکھ کر زہیر مغموم ہو گئے۔ اس سے بڑھ کر صدمہ انہیں اور کیا
ہو سکتا تھا۔ کہ جن رُفقاء سے اُنہیں بڑی بڑی اُمیدیں تھیں وہ شہادت کا
نام سُن کر ہی خاموش ہو گئے تھے۔ اور جو خیمہ چند لمحے پیشتر بلند قہقہوں
سے گونجتا تھا۔ وہاں اب قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی ؏

(۲)

دُوسرے خیمہ میں جب زہیر کی اہلیہ کو اس بات کی خبر ہوئی۔ تو
انہوں نے شوہر کو پیغام بھیج کر اندر بلوا لیا اور کہنے لگی میرے سرتاج!
آج میں یہ کیا سُن رہی ہوں۔ فرزندِ رسولؐ اپنے غلاموں کو طلب فرمائیں
اور اس حکمنامہ پر لبیک کہنے کی بجائے بنی نخلیہ بغلیں جھانکنے لگیں۔

کیا اب بھی یہ لوگ مرد کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان سے کہہ دیجئے کہ چوڑیاں پہن لیں۔ اور گھروں میں جا بیٹھیں۔ آہ۔ آپ بھی تو مغموم نظر آتے ہیں۔ میرے آقا! کیا مردوں کو جان اتنی ہی پیاری ہوتی ہے۔ کہ اجل کو پیش نظر دیکھ کر اُن کا دل کانپ اُٹھتا ہے۔ کاش آپ ہی جہاد کے لئے مولا کے حضور میں جا پہنچتے۔ اور اُن کی قدم بوسی کا فخر حاصل کرتے ہیں! آپ ابھی تک خاموش ہیں۔ میرے اللہ عورتوں پر سے امتناع جہاد کا حکم ساقط کیوں نہیں ہو جاتا۔ اگر کوئی غیبی طاقت مجھے مرد بنا سکتی۔ تو میں فی الفور خاکپائے ابن رسولؐ کا سُرمہ آنکھوں میں لگاتی! ور راہِ خدا میں اپنی جانِ شیریں قربان کر دیتی"۔

زہیر اہلیہ کا جذبہ حُب دینی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اُن کے چہرے سے جس پر چند لمحے پیشتر آثارِ غم ہویدا تھے مسرت جھلکنے لگی۔ انہوں نے کہا۔ بیگم۔ زہیراور موت سے خوف کھائے؟ یہ قطعاً ناممکن ہے۔ میرا سکوت تو ان رفقاء کی بیوفائی پر تھا۔ جنہوں نے پیغام حسینؑ پر اظہار مسرت کی بجائے سکوت اختیار کر لیا۔

زہیر فی الحقیقت مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن بیگم کے کلمات نے جوشِ ایمانی کی بجھتی ہوئی آگ پر تیل ڈال دیا۔ پُرجوش لہجہ میں بولے۔ کوئی جائے یا نہ جائے۔ لیکن زہیر مطابعت حسینؑ میں سے کسی سے پیچھے

نہیں رہیگا آؤ عفت شعار بی بی آؤ۔ میری رفیقہ حیات۔ تم سچی مومنہ ہو۔ آؤ تمہیں الوداع کہہ دوں۔ زہیر جاتا ہے۔ اُس نے تمہیں اپنے حقوق سے آزاد کیا۔ تم اس کا مہر معاف کر دو۔

شوہر کی زندگی میں اس کی دائمی مفارقت کا منظر اس قدر رقت انگیز تھا۔ کہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ جاؤ میرے سرتاج۔ لیکن جب فرشتے تمہیں شہنشاہِ کونین کے سامنے حاضر کریں۔ تو اس لونڈی کو بھول نہ جانا۔ کیونکہ اس شفاعت کی سفارش تمہارے ہی کرم پر منحصر ہے"۔

زہیر بن قین نے گھوڑے کی باگیں اُٹھالیں۔ اور بولے "اچھا خدا حافظ" ابھی چار قدم بھی نہ چلنے پائے تھے۔ کہ اُس مخدرۂ عصمت نے دوڑ کر عنانِ رہوار تھام لی اور کہا "جب تم جاتے ہو۔ تو مجھے بھی ساتھ لے چلو مجھے اُن مردمانِ بنی نخلیہ سے اپنی حفاظت کی کیا امید ہو سکتی ہے جنہوں نے اطاعتِ فرزندِ رسولؐ پر دنیاوی عیش و عشرت کو ترجیح دی۔ تم فرزندِ رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر فرضِ مودۃ ادا کرنا اور میں دختران محمد مصطفٰےؐ کی زیارت کا فخر حاصل کروں گی۔

بی بی کا اشتیاق کامل دیکھ کر زہیر اُس کی درخواست کو رد نہ کر سکے۔

(۳)

کاروانِ امامؑ تین منزلیں طے کر چکا۔ اب چوتھی منزل واقصیہ پر مقیم تھا۔ جاں نثارانِ ابن علی سائے میں ٹہل رہے تھے۔ اور بعض رومال بھگو بھگو کر سروں پر رکھتے جاتے تھے۔ گرمی اِس بلا کی تھی۔ کہ الامان زیرِ پا زمین تلوے جھلسائے دیتی تھی۔ اور سر پر آسمان آگ کی بارش کر رہا تھا۔ ہر شخص عارضی طور پر حرارت کے اثرات دُور کرنے کی کوشش میں تھا۔

.....لیکن فرزند رسولؐ کی نہ جھپکنے والی آنکھیں دُور..... بہت دُور..... ایک مرد مجاہد کی منتظر تھیں۔ جونہی گرد کاررواں نظر آئی۔ امام عالیمقام بول اُٹھے۔ "قین کا دلاور بیٹا آپہنچا۔ اس کی پیشوائی کا بندوبست کرو"۔

اسی وقت سر فروشانِ علی کا ایک گروہ آنے والے کے استقبال کے لئے روانہ ہُوا۔ جب زہیر نے امام مظلومؑ کے فدائیوں کو آتے دیکھا۔ تو گھوڑے سے اُتر پڑے۔ انصارانِ حسینؑ نے انہیں حلقہ میں لے لیا۔ اور ابنِ رسولؐ کے حضور میں لے آئے۔ زہیر شہزادۂ کونین کے رُوبرو آکر حضور کے پائے مقدس پر گر پڑے۔ اور ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے بولے "زہے نصیب کہ حضور نے اِس غلام کو یاد فرمایا"۔

ابن فاطمہؑ نے زہیر کو اُٹھا کر سینہ سے لگا لیا۔ اور فرمانے لگے۔ مجھے پہلے ہی اُمید تھی۔ کہ قین کا شیر شبیر قالین نہیں۔ بلکہ شیر نیستان ثابت ہوگا۔ دوسری طرف اِس مردِ غازی کی رفیقۂ حیات نے مخدراتِ عصمتؑ و طہارت کے قدم چوم لئے۔ جو اُن کے استقبال کے لئے خیمہ کے دروازہ تک آئی تھیں ؎

(۴)

مجاہدین علیؑ نے تشنہ لب لشکرِ حُر کو اپنے مشکیزوں کے پانی سے سیراب کیا تھا۔ اس کا بدلا انہیں یہ ملا۔ کہ حُر کی سپاہ نے انہیں حراست میں لے لیا۔ آخر یہ لوگ کنارۂ فرات پر پہنچے۔ جہاں پیاس کی شدت سپاہِ یزید کی اِسلام کُش تلواریں اور خونِ مسلم کی ارزانی ان کی منتظر تھی ؎

شام کا وقت تھا۔ امام علیہ السلام لشکرِ غنیم کو خطبہ سُنا کر واپس آئے۔ اور خیمہ میں تشریف لے گئے۔ اسی وقت زہیر دشمن کے رُوبرو جا پہنچے۔ اور انہیں سمجھانے لگے۔ انہوں نے کہا... "اے وہ لوگو کہ یزید کے حق میں تیغ اُٹھا کر حسین ابن علیؑ سے لڑنے آئے ہو۔ میری بات غور سے سُنو۔ یہ جنگ سلطنتوں کی باہمی جنگ نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ہماری حُبِ ایمانی کا امتحان لے رہا ہے۔ مَیں جانتا ہوں۔ کہ آج رفقائے حسینؑ کے پاس دولتِ دُنیا نہیں لیکن جنت الفردوس میں جو جو نعمتیں اُنہیں حاصل ہونگی

اُن کے لئے جانِ شیریں لُٹا دینا کوئی مہنگا سودا نہیں۔ مَیں یزید پلید کا ذکر کیا کروں۔ شہزادۂ کونین کے اسمِ گرامی کے ساتھ اس ملعون کا نام لینا بھی گوارا نہیں۔ مسلمانو! یہ تمہاری غیرت کا امتحان ہے۔ تم فرزندِ رسولؐ کی امداد نہیں کر سکتے۔ نہ سہی۔ لیکن یہ تو کر سکتے ہیں۔ کہ آلِ محمدؐ کا خون بہانے سے انکار کر دو۔ سوچو۔ مالکِ کوثر و تسلیم کے سامنے کیا مُنہ لے کر جاؤ گے۔ روزِ شفاعت سرورِ عالم کے رُوبرو کونسا عذرِ لنگ پیش کرو گے؟"

یزید کے سپاہی جنہیں دولتِ دُنیا کی طمع اور شمر کے سحرِ سامری نے مسحور کر رکھا تھا۔ یہ الفاظ سُن کر چونک پڑے۔ جیسے کسی نے خواب سے جگا دیا ہو۔ وہ اپنی جگہ خاموش کھڑے یہ سوچ رہے تھے۔ کہ یزید کی حمایت کرنے میں ہم کس حد تک حق بجانب ہیں۔ جب شمر نے دیکھا۔ کہ اس کا سحر ٹوٹنے والا ہے۔ تو چالاکی سے آگے بڑھا۔ اور بولا "خدا کی شان۔ کوفہ کا مالک آج ہمیں دینِ متین کا سبق دینے آیا ہے۔ اگر جان عزیز ہے تو یہاں سے چلا جا۔ اور اپنے یہ پند و نصائح ابنِ علیؑ کے لئے رہنے دے۔ کہ انہیں سُن کر وہی مسرور ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر شدّتِ تشنگی وا شتہا سے مجبور ہے۔ تو حسینؑ کا ساتھ چھوڑ کر دہ یزید میں شامل ہو جا ہم تیری حاجت پُوری کر دینگے۔"

یہ کہہ کر اس خبیث نے ایک تیر زہیر کی طرف پھینکا جس سے یہ

ظاہر کرنا مقصود تھا۔ کہ تیرے خُطبہ کا جواب ہم الفاظ کی بجائے تیروں سے دینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ زہیر کا خُون جوش مارنے لگا۔ انہوں نے پُر غضب لہجہ میں کہا۔ او خدا و رسولؐ کے مُنکر۔ زبان روک جن بہادروں نے حسینؑ کی رفاقت اس لئے قبول کی ہے کہ تاجِ شہادت کو اپنے سر کی زینت بنائیں وہ اِس فانی دُنیا کی فانی نعمتوں کے لالچ میں نہیں آسکتے۔ ہم گھر سے نکلے ہیں تو ہتھیلی پر سر رکھ کر اور سر سے کفن باندھ کر۔ لیکن یاد رکھ کہ مجھ جیسے ہزاروں بُزدلوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار کر شہید ہونگے"۔

فاطمہ کے نُورِ نظر نے خیمہ میں زہیر کی آواز سُنی تو بولے "ابنِ قین! اب لوٹ آؤ۔ کہ کُفّارِ یزید کو نصائح کرنا ریت سے تیل نکالنے کے مترادف ہے"۔

(۵)

حسینؑ مظلوم کے نصف سے زیادہ جاں نثار شہید ہو چکے۔ تو زہیر قین آگے بڑھے اور قدموں پر گر کر بولے "بہت ہو چکی۔ اب تابِ شکیبائی نہیں۔ اِس غلام کو بھی اجازت مرحمت فرمائیے"۔

امام عالی مقامؑ نے انہیں سینے سے لگا لیا۔ اور کہا۔ جاؤ۔ خُلد کی شاہراہ تمہارے سامنے ہے۔ اور بہشت میں جنابِ امیرؑ کوثر کا جام

لئے تمہارے منتظر ہیں"۔

زہیر خیمۂ عصمت و طہارت کے پاس ہو کر نکلے۔ تو کسی نے مری ہوئی آواز سے کہا "اِس لونڈی کا آخری سلام"۔

زہیر نے پیٹھ موڑ کر دیکھا۔ تو خیمہ کے پردہ میں سرسراہٹ سُنائی دی زہیر نے "خُدا حافظ" کہا اور گھوڑا بڑھا کر آگے نکل گئے۔ کچھ دیر بعد ان کی تلوار عمرو سعد کی سپاہ کو جہنم واصل کر رہی تھی۔ ایک ..... دو..... تین .... نہیں پُورے یک صد کفار اس جانباز حسین نے تلوار کے گھاٹ اُتار دئیے۔ جب ہاتھوں میں سکت نہ رہی۔ زخموں سے نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اور بہ آواز بلند بولے۔ "مولا! بس۔ اب یہ غلام رُخصت ہوتا ہے"۔

جب حبیب خدا کا فرزند سرِ بالیں پہنچا۔ اُس وقت زہیر کا طائر رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔ لبوں پر تبسّم تھا۔ اور کھُلی آنکھوں میں اشتیاقِ دیدار شہید کربلا نے شیر قین کی آنکھوں کو بوسہ دیا اور بولے "اللہ تعالےٰ کی رحمتیں تم پر نازل ہوں"۔

خیمۂ عصمت و طہارت میں زہیر کی شہادت کی خبر پہنچی۔ تو ایک کُہرام مچ گیا۔ خواتینِ اہلبیت رسولؐ کبھی زہیر کی لاش کی طرف دیکھتیں اور کبھی اس نیک بی بی کی طرف جس کی آنکھوں سے دجلہ و فرات

بہہ رہے تھے۔ شہید کی اہلیہ روتی تھی۔ اور نہایت ہی درد انگیز لہجہ میں
کہہ رہی تھی...... تم چلے گئے۔ لیکن مجھے یہاں چھوڑ گئے۔ کیا بہشت میں
اس لونڈی کے لئے جگہ نہ تھی۔ میرے آقا۔ میرے سرتاج۔ جائیے۔ کہ
آقائے دو جہاں کی رحمت تم پر نثار ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ مگر
اس بندی کو بھول نہ جانا جس نے برضائے خود...... بہ ترغیب خود
اللہ کی راہ میں اپنے سہاگ کی قربانی دی ہے"۔

---

# دھوپ چھاؤں

(۱)

جس طرح دھوپ کے دوش بدوش چھائیں اور تاریکی کے قدم بقدم روشنی رہتی ہے۔ اُسی طرح گُناہ کے ساتھ نیکی کا وجود بھی ہے۔ اگر دُنیا میں صرف گنہگار ہی بستے ہوں۔ تو خداوند عالم کا قہر اس خوبصورت کائنات کو پھُونک ڈالے۔ بدی جب نیکی پر غالب ہو جائے۔ تو نکوکاروں کو خُون کے آنسو رُلاتی ہے۔ آج سے کئی سو برس ایسا ہی ایک موقعہ پیش آیا تھا۔ اُس سے اہل دِل پر اتنی رقّت طاری ہوئی۔ کہ وہ خوب روئے اور اب تک رو رہے ہیں +

مُسلم کی شہادت کے بعد اُن کے یتیم محمد و ابراہیم زنداں کی آہنی

سلاخوں میں بند آنکھوں میں آنسو بھرے خداوند کریم کو یاد کر رہے تھے انہیں امداد کے لئے پکار رہے تھے۔ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام دن گریہ میں بسر ہوتا تھا۔ تو رات آہ و زاری میں گزرتی تھی۔ آہ کوفہ.... سنگ دل کوفہ جس نے چند روز قبل ایک پردیسی مومن کی شہادت کا نظارہ دیکھا تھا۔ اب ان معصوم بچوں کا خون بہتا دیکھنے کا منتظر تھا! ادھر جاں نثار اہلبیت حضرت عباسؑ کی بہن کے زیر نظر لخت دل کھانے اور خون جگر پینے میں مصروف تھے جیل خانہ میں مجبور بند قیدیوں کے لئے اس سے بہتر غذا اور ہو ہی کیا سکتی ہے +

دفعتہً زندان کا دروازہ کھلا۔ اور جیلخانہ کا پیر سال محتسب قیدی قتیل جفا مسلمؑ کے بیٹوں کے قدموں میں گر پڑا۔ اُس کی آنکھیں ضبط گریہ سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ اور لمبی سفید ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی یتیموں نے اس بزرگ خضر صورت کو شانے پکڑ کر اُٹھایا اور پوچھنے لگے "بابا روتے کیوں ہو۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم مصیبت میں ہو۔ غم زدوں کی تسکین۔ اور مظلوموں کی امداد۔ آل رسولؐ کا شیوہ ہے۔ مگر اسوقت ہم خود قید میں ہیں۔ تمہاری مدد کیونکر کریں؟" +

محتسب پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ محمد و ابراہیم کے ننھے ننھے تلوے اپنی آنکھوں سے مس کرتا ہوا بولا۔ "میں گنہگار ہوں اور میری سب سے بڑی

مصیبت یہ ہے۔ کہ یزیدی حکومت کا نمک خوار ہوں۔ مگر اس وقت آپ سے مدد مانگنے نہیں آیا۔ آلِ رسولؐ کے تئیں اپنا فرض ادا کرنے آیا ہوں۔ میرے آقا زادو! آپ کی رہائی کا وقت آ پہنچا۔ شب کو زنداں کا دروازہ کھُلا رہے گا۔ تم تاریکی میں بھاگ کر اپنی جان بچا لینا"۔

یہ بدی پر نیکی کی فتح تھی۔ مصائب و آلام کی کڑکتی دھوپ کی جگہ گھنی چھاؤں نے لے لی۔ رات کے سنّاٹے میں قاصد حسینؑ کے یتیم زنداں سے نکلے۔ اور جنگل کی طرف چل دیئے۔ خاندانِ رسالت کے ان نونہالوں کی غریب الوطنی اور آوارگی سے متاثر ہو کر تاریک رات نے ماتمی لباس پہن لیا۔ جنّ و ملائک آنسو بہانے لگے۔ اور تیز چلنے والی ہوا نے بھی دم روک لیا۔

جنگل میں پہنچ کر دونوں بچّے سو گئے۔ اور ایسے سوئے کہ طلوعِ آفتاب کے بہت دیر بعد بیدار ہوئے۔ پیٹ میں آنتیں لاحول ولا پڑھ رہی تھیں۔ بھوک اور پیاس کے مارے بُرا حال تھا۔ اِن شہزادوں پر آفت پڑی جنہیں ماں غُروبِ آفتاب کے بعد کبھی گھر سے باہر نہ نکلنے دیتی تھی۔

اب انہوں نے ایک رات لق و دق جنگل میں گزاری تھی۔ اور یہ نہ جانتے تھے۔ کہ دوسری شب اُن کے لئے کیا پیغام لائے گی۔

(۲)

دن کے بعد پھر رات آئی۔ وہی کالی اور بھیانک رات مسلم کے بھولے بچے اپنی جائے پناہ سے باہر نکلے۔ شدت اشتہا نے انہیں موت کے منہ میں جانے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے کوفہ کا راستہ لیا۔ اس کوفہ کا جہاں انکے والد محترم کا خون بہایا گیا تھا۔ جہاں کے لوگوں نے شاہ یثرب کے قاصد کے ساتھ دغا کی تھی۔ ہاں۔ وہ دل میں امید کو جگہ دے کر ان لوگوں کے پاس جا رہے تھے۔ جنہوں نے امام مظلومؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا وعدہ ایک شرابی کی توبہ کی طرح توڑ ڈالا تھا +

گردش ایام انہیں ایک ضعیفہ کے مکان پر لے گئی۔ جہاں نیکی ان کا استقبال کرنے کے لئے بے قرار تھی۔ اور بدی ان کی جان لینے کے لئے بیچین۔ دھوپ چھاؤں کا اجتماع اسی کو کہتے ہیں۔ پہلے نیکی غالب آئی۔ پھر بدی کی فتح ہوئی۔ مسلم کے بیکس بچوں کو کیا علم تھا۔ کہ ان کی زندگی کی صرف چند ساعتیں باقی ہیں۔ اور اس کے بعد وہ بھی اپنے مرحوم باپ کی آغوش میں ہونگے۔ وہ عالم کے شہزادے اس مکان کے باہر کھڑے اپنی یتیمی و مظلومی پر آنسو بہا رہے تھے۔ کہ بڑھیا اسی ضرورت سے باہر آئی۔ عورت کا دل فطرتاً نرم ہوتا ہے۔ اور بچوں کے آنسو دیکھ کر تو فوراً پگھل جاتا ہے۔ اس نے پیار سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی وہ تم کس چمن کے پھول اور کس

گھر کے چراغ ہو۔ تم پر کیا آفت پڑی۔ جو اس طرح گریہ کناں پھرتے ہو؟"
ضعیفہ کے لہجہ میں ہمدردی تھی۔ اور محبت بھی۔ محمدؑ و ابراہیمؑ نے بلاکم و کاست اپنے مصائب کی لرزہ خیز داستان ضعیفہ کو سنادی۔ ضعیفہ سنّاٹے میں آگئی۔ تصدیر ہی تصدیر میں اُسے ایک خوفناک منظر دکھائی دینے لگا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ یزیدی سپاہی اُسے گھسیٹ کر حاکمِ کوفہ کے دربار میں لئے جا رہے ہیں۔ اور اُس کی لاش کو کتّوں سے نچوانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اِس جرم میں کہ اُس نے مسلم کے بچّوں کو کیوں پناہ دی۔ بڑھیا کیلے کے پتّے کی طرح کانپنے لگی۔ جی میں آیا۔ کہ محمد و ابراہیم کو دھتکار کر نکال دوں۔ اُس کے دل میں نیکی و بدی کی جنگ ہو رہی تھی۔ اور ایک بار پھر نیکی بدی پر غالب آئی۔ اُس نے دل میں سوچا۔ میں دُنیا کے سُکھ دیکھ چکی۔ اب کے دن جیوں گی۔ قیامت کے روز جب رسول اللہ مجھ سے پُوچھیں گے۔ کہ میں نے اُن کے جگر پاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ تو کیا جواب دُونگی۔ اُس خیال سے بڑھیا کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ اور والدہ محبت آمیز لہجہ میں بولی "غریب خانہ کو اپنی کنیز کا گھر سمجھو۔ کھانا کھا کر آرام کرو۔ اگر خدا کی رحمت شاملِ حال رہی۔ تو علی الصبح تمہیں کسی کے ساتھ مدینہ منوّرہ بھیج دونگی"۔
یہ کہہ کر مومنہ نے محمد و ابراہیم کو سینے سے لگالیا۔ اندر لے جاکر

کھانا کھلایا۔ اور اُنہیں ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں لے گئی۔ اور بولی "تُم تھکے ہوئے ہو۔ رات کی رات آرام کر لو"۔

بُڑھیا چلی گئی۔ بچے سو گئے۔ وہ سمجھے تھے۔ کہ اب مصائب کی گھٹائیں دُور ہو گئیں۔ لیکن موت ان کے سر پر کھڑی کہتی تھی "ہاں خُوب سو۔ کیونکہ بیدار ہوتے ہی میں تمہیں جنّت میں پہنچا دونگی۔ وہاں جہاں یزید نہیں۔ اُس کا ظُلم نہیں۔ کُوفہ والوں کی سی بدعہدیاں نہیں۔ اور لوگوں کو آلِ رسولؐ سے دشمنی نہیں"۔

(۴)

نصف شب کے قریب کسی نے باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بُڑھیا نے اُٹھ کر کھولا۔ تو اُس کا بدسرشت و کافر شوہر پریشان و بدحال سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے اندر آنے پر بُڑھیا نے دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا۔ تو وہ بولا "مُسلم کے بچے کل سے فرار ہیں۔ حاکم کُوفہ نے اُن کی گرفتاری کے لئے انعام مُشتہر کیا ہے۔ مفرورین کو تلاش کرتے کرتے یہ وقت آ گیا۔ مگر ان کا کہیں پتہ نہیں۔ اچھا اب کھانا لاؤ۔ کل صُبح پھر قسمت آزمائی کرونگا"۔

ضعیفہ کھانا دینے لگی۔ اُس کا دِل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ شوہر کی حریص طبعی سے خُوب واقف تھی۔ اور جانتی تھی۔ کہ اُس پر راز فاش کرنے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ اسے خُوب معلوم تھا۔ کہ اُس کی التجائیں اور

ننھّے یتیموں کی چیخ و پکار۔ اُسے قاصدِ حسینؑ کے جگر پاروں پر ہاتھ اُٹھانے سے روکنے میں ناکام رہے گی۔ اب اُس کے لئے ایک ہی چارہ کار تھا۔ اور وہ یہ کہ خاموش رہے۔ اور خدا پر بھروسہ کر کے صبح صادق کا انتظار کرے٭

کھانا کھانے کے بعد ضعیفہ کا شوہر سو گیا۔ لیکن دو گھڑی بعد ایک ہلکی سی چیخ سُن کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مُسلم کے بچّوں نے خواب میں اپنے باپ کو آغوش کھولے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اُن کی نیک و پاک رُوح کہہ رہی تھی۔ "میرے دلدار و! آؤ۔ تمہیں بابا کے پاس لے چلوں۔ تم تنہا یہاں گھبرا رہے ہو۔" کہتے کہتے رُوح نے دونوں کو گود میں لے لیا تھا۔ یتیم بچّے یہ خواب دیکھ کر جاگ اُٹھے۔ اور چھوٹا بھائی تو اس قدر گھبرایا۔ کہ اس کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اُس چیخ کو سُن کر ضعیفہ کے شوہر کی آنکھ کُھل گئی تھی اور اس کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ جہاں خاندان ہاشم کے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے سسکیاں بھر بھر کر رو رہے تھے ضعیفہ کا شوہر اُن دونوں کو پکڑ کر باہر لایا۔ اور چراغ کی دھندلی روشنی میں اُن کے چہرے کو دیکھ کر خوشی سے ناچ اُٹھا۔ کنواں خود پیاسے کے پاس چلا آیا تھا۔ انعام کے لالچ سے اُس نے جن ستم رسیدوں کی تلاش میں دن بھر بادہ گردی کی تھی۔ وہ اب اُس کی مُٹھی میں تھے٭

ضعیفہ بھی اُٹھ بیٹھی۔ اور اپنے دوزخی شوہر کی آنکھوں میں شیطانی

چمک دیکھ کر رونے لگی۔ مگر اس ملعون کو بیوی کے آنسوؤں کی اتنی پرواہ نہ تھی۔ جتنی چاندی کی چند ٹھیکریوں کی۔ اِس جلّاد نے پردیسی سیّد کے بچوں کو ستون سے باندھ دیا۔ اور تلوار کی دھار تیز کرنے لگا۔ کیسا خوفناک نظارہ تھا عقیل کے پوتے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اور جلّاد اُن کی موت کے سامان کر رہا تھا۔ بچّے اسی طرح بندھے رہے۔ اور اس ملعون کو نیند آگئی۔ آخر صبح ہوئی لیکن یہ وہ صُبح نہ تھی۔ جب پرندے چہچہاتے ہیں۔ بُلبلیں گاتی ہیں۔ اور آفتاب مشرق کے دریچہ میں سے مُنہ نکال کر کائنات میں اُمّید اور زندگی پھُونک دیتا ہے آج صُبح تاریک تھی۔ رات سے بھی زیادہ اندھیری۔ سُورج نے اپنا چہرہ گھنے بادلوں میں چھپا لیا تھا۔ اور طائرانِ خوشنوا خاموش تھے۔

ضعیفہ کا شوہر مُسلم کے یتیم بچّوں کو گیسوؤں سے گھسیٹتا ہوا دریائے فرات کے کنارے لے گیا۔ تلوار کے دو بھرپور ہاتھ اُن کی گردنوں پر پڑے۔ اور وہ دونوں ختم ہوگئے۔

جب آفتاب طلوع ہوا۔ تو ضعیفہ ان بچّوں کی لاشوں پر آنسو بہانے میں مصروف تھی۔ اور اس کا بدنہاد شوہر بیحد مسرور ان ننھے بچّوں کے سر حاکم کُوفہ کے پاس لے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

بجلی رُوتی تھی۔ بدلی ہنس رہی تھی۔ یہ تھا۔ دھوپ چھاؤں کا اجتماع۔

# جنّت کا مُسافر

## (۱)

صحرائے کربلا میں بر لبِ فرات چند بے خانماں اور غریب الوطن مُسافروں کے خیمے نصب ہیں۔ کچھ خیموں میں پردہ نشین بیبیاں ہیں اور اِدھر اُدھر چند ایک نیک مرد غمگین و نڈھال نظر آتے ہیں۔ وہ دیکھو ایک خیمہ کے دروازہ پر ایک پُر جلال نُورانی شکل و سفید ریش بزُرگ کھڑے نظر آتے ہیں۔ چہرے کی جُھریوں اور آنکھوں کے گرد حلقوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کسی بہت بڑی آفت کا سامنا ہے لیکن سخت مضمحل ہونے پر بھی ان کے پائے استقلال نے لغزش کھانا نہیں سیکھا۔ چہرہ پر درد و کرب کے آثار ضرور ہویدا ہیں۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ

نورِ ایمان بھی رُخِ روشن کے گرد ہالہ بنائے ہوئے ہے۔ آخر یہ ہیں کون؟ کوئی ہوں۔ لیکن صاحب ایمان اور خدا رسیدہ بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے۔ کہ اللہ اپنے نیک بندوں سے محبت کرتا ہے۔ تو ان بندوں میں ان کا درجہ افضل ہے۔ ہاں تو یہ کون ہیں؟ یقیناً امام حسین علیہ السلام کے سوائے اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ وہ دیکھو لشکرِ یزید بھی کچھ فاصلہ پہ متعین ہے۔ حق و باطل۔ ایمان و کفر کی لڑائی ہو رہی ہے۔ امام حسینؑ کے پاس انے گنے آدمی ہیں۔ اور کچھ بچے فریق ثانی ایک تربیت یافتہ فوج پر مشتمل ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آج کفر فتحیاب ہو گا۔ لیکن یہ فتح دنیاوی ہے۔ دینی نہیں۔ خدا کے گھر میں تو فتح کا سہرا لازمی طور پر امام مظلوم کے سر ہی بندھے گا۔

قریب ہی بیبیوں کے خیمے ہیں۔ خبردار ان کا پردہ اُٹھا کر اندر جھانکنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ حرم سرائے عصمت ہے۔ ان میں خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی بہو بیٹیاں مقیم ہیں۔ وہ جن کی عصمت و پاکدامنی کا گواہ خدا ہے۔ سنتے ہو؟ ان خیموں سے آہ و بکا کی آواز آ رہی ہے۔ ایسے بھی کیوں نہ جبکہ مسلم کا یتیم زینبؑ کے جگر پارے عقیلؑ کے نورِ نظر امام حسینؑ کا شہزادہ اور رفقائے اسلام کے بہت سے جواہر ریزے خاک میں بکھر چکے ہیں۔ تم ان مظلوم اور دکھیا بیبیوں کے مقدس آنسو پونچھنا چاہتے ہو؟

نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ یہ کام خدا اور اس کے رسولؐ کا ہے۔ اگر تمہارے دل میں آلِ محمدؐ کے لئے کچھ محبت اور اُن کے مصائب کے لئے کچھ ہمدردی ہے۔ تو روؤ۔ امام مظلومؑ کی قیامت خیز مصیبت پر روؤ۔ بنہ بدی کافروں کی دراز دستیوں پر روؤ ٭

(۲)

یہ کیا؟ یہ چھریرے بدن کا کڑیل جوان کدھر جارہا ہے۔ اٹھارہ برس کی عمر جوانی کا زمانہ۔ اُمنگوں کے دِن۔ چلتا ہے تو قیامت بپا ہوتی ہے۔ بولتا ہے۔ تو مُنہ سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ اب تک اس کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ لو اب وہ بالکل سامنے ہے۔ ہیں؟ کیا یہ رسول اللہؐ ہیں؟ وہی شکل و صورت۔ وہی لباس۔ وہی رفتار و گفتار۔ لیکن رسول اللہؐ تو حق سے واصل ہو چکے۔ وہ تو اپنے محبّ و محبوب اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ ان کا اس لق و دق میدان میں کیا کام۔ عقل سخت حیران ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اچنبھے پر اچنبھا یہ کہ شکل رسول امام مظلوم کے قدموں پر گر پڑی۔ اگر یہ رسول اللہ ہوتے۔ تو امام حسینؑ کو اپنے نانا کے قدم لینے چاہئیں تھے سُنئے تو سہی۔ سیدالشہداءؑ کچھ فرما رہے ہیں۔ شاید ان کی بات سُن کر ہی یہ معلوم ہو سکے۔ کہ یہ نوجوان کون ہے؟

امام مظلوم فرما رہے ہیں "کہو بیٹا۔ اپنے ستم رسیدہ باپ سے

کیا کہنا چاہتے ہو؟"

او ہو۔ یہ تو علی اکبرؑ ہیں۔ امام حسین علیہ السلام کے فرزند دلبند لیکن شکل و صورت بالکل رسولِ خداؐ کی سی ہے۔ اور مشابہت اس قدر غیر معمولی ہے۔ کہ ہم دھوکا کھا گئے۔ خیر"

علی اکبرؑ کے لبوں کو حرکت ہوتی ہے۔ دست بستہ کھڑے ہو کر عرض کرتے ہیں "پدر بزرگوار۔ ساقی کوثر کا جام حرکت میں ہے۔ کیا میں رسولؐ خدا صلعم کی اولاد۔ شیرِ خدا کا پوتا۔ اور امام عالیمقام کا فرزند مئے شہادت کے ایک گھونٹ کے لئے ترستا ہی رہونگا۔ چچا عباس عون و محمد۔ عبداللہ شہید ہو چکے اب میری باری ہے۔ مجھے از راہ خدا میدان جنگ میں جانے کی اجازت مرحمت فرمائیے"۔

امام حسینؑ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ جانتے تھے۔ کہ یزید کے گناہوں کا پیمانہ لبریز ہونے میں کچھ دیر ہے! ور بہت جلد یہ دن بھی دیکھنا پڑیگا۔ لیکن ان کے سینے میں باپ کا دل تھا۔ پتھر کا ٹکڑا نہیں۔ جی بھر آیا۔ اور فرمایا "جان پدر۔ بھائی کی موت نے میری کمر توڑ دی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو۔ کہ حسینؑ کی آنکھوں کا نور بھی چھین لو۔ تو تمہاری مرضی مگر اپنی ماں کے کلیجہ پر پتھر باندھ آؤ۔ اور اپنی پھوپھی سے رخصت لے لو۔ جس نے اپنا مہر مادری تم پر قربان کر دیا ہے۔ اپنے بچوں کے لئے بھی

کچھ نہیں رکھا"۔

ہمشکل رسول علی اکبر خیمہ عصمت وطہارت کی طرف چلے۔ اور جب پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ تو ان کے لب لعلین پر ایک شیریں تبسّم نمایاں تھا۔ جناب زینبؑ کا ماتھا ٹھنکا اور گھبرا کر بولیں "بیٹا میں تمہیں خنداں و شاداں دیکھ کر جیتی ہوں۔ مگر اس قیامت گاہ میں تمہارے لبوں پر تبسم کیسا؟ میرا جی گھبرا رہا ہے۔ دل پہلو سے نکلا جاتا ہے۔ جلدی بتاؤ۔ تم غم نصیب پھوپھی کے آشیانے پر کونسی بجلی گرانے آئے ہو؟"

علی اکبرؑ کے دل پر چوٹ لگی لیکن آنکھ سے پانی نہ نکلا۔ پھوپھی کو تسلّی دیتے ہوئے بولے "پھوپھی امّاں گھبراتی کیوں ہو۔ خدا ہمارا امتحان لے رہا ہے۔ رسول کریم صلعم جنّت کی بلندیوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کہ ان کی اولاد حق کو عزیز رکھتی ہے یا اپنی جان کو۔ تم جھگڑا ترک کیجیے اور مجھے خوشی خوشی رخصت کیجیے"۔

غم نصیب پھوپھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی! وہ بولی "بیٹا۔ میں تو تمہاری دائی ہوں۔ تم پر میرا حق ہی کیا ہے۔ جس نے تمہیں اپنے دودھ سے پالا ہے۔ وہ جان بوجھ کر موت کے منہ میں کیسے بھیج دے"۔

یہ کہتے کہتے زینب بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑیں۔ پھوپھی کو کچھ ہوش آیا۔ تو علی اکبرؑ ماں سے اجازت کے طلبگار ہوئے۔ اُمّ لیلیٰ نے آنکھیں

میں آنسو بھر کر کہا۔ "میرے راج دُلارے۔ اگر تمہارے بابا رضا مند ہیں۔ تو میں اعتراض کرنے والی کون؟"

انہوں نے کہنے کو تو یہ الفاظ کہہ دئے۔ مگر علی اکبرؑ ابھی دروازہ کی طرف مڑے ہی تھے۔ کہ اُم لیلےٰ کو غش آگیا۔ حضرت علی اکبرؑ نے جب دیکھا تو وہ جی کڑا کرکے دروازے کی طرف بڑھے۔ لیکن ابھی پردہ نہ اُٹھانے پائے تھے۔ کہ بچوں اور بیبیوں نے پھر گھیر لیا۔ اور سب اُن کا دامن پکڑ کر رونے اور آنسو بہانے لگیں۔ کچھ دیر بعد وہ دامن چھڑا کر باہر آئے۔ تو بہت سے بچوں نے ان کا دامن تھام رکھا تھا۔

جنت کا مسافر مُسکرا رہا تھا۔ ہاں عروسِ شہادت سے ہمکنار ہونے کے لئے مُسکرا رہا تھا۔

(۳۱)

شیر خُدا کا پوتا میدانِ جنگ کی طرف چلا۔ باپ نے اپنے دستِ مبارک سے شیر خدا کا کمر بند علی اکبرؑ کی کمر میں باندھا اور عمامۂ رسول سر پر رکھ کر کہا۔ "بیٹا اب تمہارے غم میں مجھے تو برہنہ سر ہی رہنا ہے۔ تم تو مجسّم تصویرِ رسالت بن جاؤ۔"

جب علی اکبرؑ گھوڑے پر سوار ہو کر چلے گئے۔ تو امام مظلومؑ نے آسمان کی طرف حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ اور ایک آہ گرم بھر کر

جس میں کائنات کو جلا دینے کی طاقت تھی۔ درگاہِ باری میں فریاد کی....
"پروردگار۔ تو اس اُمتِ جفا کار پر گواہ رہیو۔ کہ ہم شکلِ رسولؐ کی
شہادت بھی اسی کے ہاتھوں سے ہوگی۔ اور ہم.... تیرے بندوں نے
رسولِ کریمؐ کو تو کھویا ہی تھا۔ اب ان کی شبیہہ بھی ہمارے ہاتھ سے جاتی ہے"
اس کے بعد غم سے نڈھال امام نے بآوازِ بلند عمر سعد کو پکارا۔ اور
کہا "خدا تیرے رحم کو قطع کرے۔ اور میرے بعد تجھ پر کسی ایسے شخص کا غلبہ
ہو۔ جو تجھے اسی طرح قطع کرے۔ جیسے تو میرے رحم کو قطع کر رہا ہے"۔
علی اکبرؑ دشمن کے مقابل پہنچ کر بولے "میں علیؑ کا پوتا حسینؑ کا فرزند
امام مظلومؑ کی حمایت میں لڑنے آیا ہوں۔ احکامِ قرآنی سے تم منحرف
ہو چکے۔ اب اس ہاشمی جوان کی تیغِ خونچکاں تمہیں اہلبیتؑ پر ظلم کرنے کا
مزا چکھائے گی"۔
یہ کہہ کر علی اکبرؑ نے تیغ زنی شروع کی۔ بات کی بات میں پرے کے
پرے کاٹ کر رکھ دیئے۔ عمر سعد کے لشکر میں بھاگڑ مچ گئی۔ اُمِ لیلےٰ کے
شیر کے بازو دشمن پر حملے کرتے کرتے شل ہو گئے لیکن کسی شخص کو سامنے
آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس پر علی اکبرؑ نے کہا "کہاں ہیں وہ بہادر
جو سام و نریمان کے بت تمغۂ شجاعت سمجھ کر اپنے سینوں پر لگاتے تھے۔
کہاں ہیں وہ پہلوان جو خم ٹھونک کر عباسؑ و حسینؑ کا مقابلہ کرنے آئے

تھے۔ وہ اب صفوں سے باہر کیوں نہیں نکلتے"؟

لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ علی اکبرؑ کی آواز فضا میں گونج کر رہ جاتی ہے۔ کسی انسان کے کان میں نہیں پڑتی +

(۴)

علی اکبرؑ تھک گئے۔ مارے پیاس کے دم نکل رہا تھا۔ جب کوئی دشمن سامنے نہ آیا۔ تو گھوڑے کو پیچھے ہٹا کر امام مظلوم کی خدمت میں پہنچے اور بولے "پدر بزرگوار۔ اب تو پیاس نے مار ہی ڈالا..."

امام حسینؑ کیا کرتے۔ اُن کے پاس آنسو بہانے والی آنکھیں تھیں خون رونے والا دل تھا۔ بےقرار مضطرب محبت تھی۔ مگر پانی نہ تھا انہوں نے اپنی زبان بیٹے کے منہ میں دے دی۔ اور پھر بولے "بیٹا مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ کہ تم ایسا حقیر سوال کرو اور ہم اسے پورا نہ کر سکیں۔ مگر اب اپنے دادا کے ہاتھ سے جام کوثر ہی پینا۔ جو مجھ سے پہلے تمہیں ملے گا۔ فرات کا پانی پی کر کیا کرو گے"+

حضرت علی اکبرؑ کے سر اور چہرہ پر جا بجا زخم لگ رہے تھے۔ امام ہمام نے اپنا عمامہ پھاڑ کر اس کی دھجیاں زخموں پر باندھ دیں۔ اور یہی نہ سہرا تھا۔ جو ام لیلےٰ کے لال کے سر پر باندھا گیا۔ خدا کی شان جس خاتون جناں کے دروازے سے کبھی کوئی سوالی خالی نہ گیا تھا۔ آج

اُس کی اولاد اِس کس مپرسی کی حالت میں اپنی زندگی کے آخری لمحے پورے کر رہی ہے۔

علی اکبرؑ تکان زدہ تھے۔ مجروح تھے۔ تین دن کے بھوکے اور تین دن کے پیاسے تھے۔ لیکن دوسری مرتبہ بھی انہوں نے میدانِ جنگ میں اسی سواروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ کربلا کی زمین یزیدی سپاہ کے خون سے تر بتر ہو گئی۔ لیکن آخر یہ غنچۂ نو شگفتہ کب تک بادِ خزاں کے جھونکوں سے محفوظ رہتا۔ اب حضرت علی اکبرؑ کو بھی زخموں کے باعث کمزوری محسوس ہونے لگی۔ جونہی ان کا دستِ ہاتھ پڑا۔ یزیدی کُتے یکبارگی اُن پر آ پڑے۔ اور اس قدر زخم لگائے۔ کہ حضرت علی اکبرؑ گھوڑے پر بیٹھ نہ سکے۔ گرے مگر اس حالت میں بھی سنبھل گئے۔ اور اپنے ہاتھ گھوڑے کی گردن میں حمائل کر کے بولے: "مجھے جلد از جلد بابا کی خدمت میں پہنچا دے"۔

وفادار گھوڑا شاید ان کی بات سمجھ گیا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگا اور اگرچہ دشمنوں نے اُسے بھی شدید زخمی کر دیا۔ لیکن باد رفتار گھوڑا رُکا نہیں۔ جنت کے مُسافر کی سواری جا رہی تھی۔ اور مُسافر گھوڑے کی پیٹھ پر نہیں۔ بلکہ اس کے گلے میں لٹک رہا تھا جسم سے خون کے فوارے چھوٹتے تھے۔ اور رگ رگ سے لہو کی بوندیں اس طرح گرتی تھیں جیسے

ساون بھادوں میں بارش ہوتی ہے۔ ایک درخت کے نیچے پہنچ کر گھوڑا کھڑا ہو گیا۔ اور علی اکبرؑ باپ کو پکار کر زمین پر گر پڑے۔ امام دُور کھڑے تھے۔ بیٹے کی آواز سُنتے ہی جان گئے۔ کہ بس۔ اب علی اکبرؑ اس دُنیا میں نہیں۔ یہ خیال آتے ہی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اور دو قدم بھی نہ چل سکے۔ فرمایا۔ بیٹا۔ کہاں ہو۔ تمہارا باپ قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہا ہے"۔

مُسافرِ جنّت کا گھوڑا امام ہمام کے پاس گیا۔ اور اُن کے قدموں میں سر رکھا۔ امام بیٹے کی رہوار کی گردن میں باہیں ڈال کر رونے لگے۔

امام بھی رو رہے تھے۔ بے زبان جانور کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ اور جنّت کا مسافر اپنے نانا کی معیّت میں آہستہ آہستہ اپنے وطن کی طرف جا رہا تھا۔

---

# چُلّو بھر خُون

(۱)

جواں بیٹے کی مَوت کا داغ جس شخص کے سینے پر لگے، اُسے پاگل ہو جانا چاہیئے یہ فطرت کا قانون ہے۔ مگر اُس سن رسیدہ و شکستہ کمر مقدّس ہستی کی جراُت کو کیا کہیں جس نے اپنے عزیز و اقارب کی جُدائی کے صدمے اُٹھائے اور آخر اپنے جوان بیٹے کو بھی سپرد خاک کر دیا۔ دُنیا سمجھتی ہو گی۔ کہ ابن رسول اللہ کی راہ میں یہ قربانی دے کر سرخرو ہو گئے مگر دُنیائے عقب میں فرشتے آنسوؤں کے ہار پرو رہے تھے۔ اُس خلیفۂ برحق کے لئے جس نے لفظی معنوں میں سرخرو ہونا تھا۔

حضرت امام حسینؑ علی اکبرؑ کو قبر کی آغوش میں سُلا کر واپس آئے تو

خاتونِ جنّت کی بہو شہر بانو دست بستہ شوہر کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ تباہ حال امام کا دِل بانو کی اُس درخواست کا تصور کرتے ہی لرز اٹھا۔ جو وہ عنقریب امام علیہ السلام کے سامنے پیش کرنے والی تھیں۔ وہ بے بس تھے۔ مجبور تھے۔ مظلوم تھے اور جانتے تھے۔ کہ بیگم کی خواہش کبھی پوری نہ ہو سکے گی۔ مگر اُسے ٹھکرا نہ سکے۔ رقّت انگیز لہجہ میں بولے "بانو۔ کہو"۔

شہر بانو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سوتہ بہہ نکلا۔ آنسو بھی وہ جن کا ایک ایک قطرہ بڑے سے بڑے گنہگار کو بھی پاکباز بنا سکتا تھا۔ مگر یہ وقت جنگل کا تھا۔ دُنیاوی ثروت کے لئے اہلبیت ہادی برحق کی عزت پر ہاتھ ڈالا جا رہا تھا۔ اور دین حقّہ اغراض انسانی پر قربان ہو رہا تھا۔ اس وقت اس مقدّس بی بی کے پاک آنسوؤں کی کیا قیمت؟

جب شہر بانو کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ تو انہوں نے سسکیاں بھرتے ہوئے فرمایا "اے فرزند رسول! میں آج تک حرف شکایت زبان پر نہ لائی۔ مگر اب نہیں رہا جاتا۔ میری گودی کا لال بے زبان اصغر پیاس کے مارے دم توڑ رہا ہے۔ پانی کے بغیر اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ میری التجا قبول فرمائیے۔ اور عمر و شمر سے کہئے۔ کہ وہ کم از کم علیؑ اصغر کو پانی کا صرف ایک گھونٹ پلا دیں۔ وہ بھی اولاد والے ہیں ان کی دشمنی فرزند رسول سے ہے۔ اس بے بس بچے سے نہیں۔ وہ ضرور

میرے لال کو بِن موت مرنے سے بچا لیں گے"۔

یہ کہہ کر شہر بانو ایسی نگاہوں سے جن سے اُمید و یاس دونوں کی جھلک تھی۔ اپنے مصیبت زدہ مگر حق پرست شوہر کے چہرۂ اقدس کی طرف دیکھنے لگیں۔ امام مظلومؑ نے فرمایا "بیگم! اگر کُفّار مقابلہ میں ہوتے۔ تو شاید تمہاری خواہش پُوری ہو سکتی۔ مگر یہ مسلمان ہیں۔ اور مسلمان بھی وہ جنہیں سیّدہ کے لال سے لاگ ہے۔ انہوں نے خانہ رسولؐ کا چراغ گُل کرنے کا تہیّہ کر لیا ہے۔ پھر وہ تیرے لختِ جگر پر رحم کیوں کرنے لگے"؟

کہنے کو تو امام شہر بانو سے یہ باتیں کہہ گئے۔ مگر جب قریب المرگ علی اصغر اور اس کی بدنصیب ماں کے پژمُردہ چہرہ پر نظر پڑی انکار نہ کر سکے۔ انہیں علی اصغر کو اُس میدانِ قتال میں لے جانا پڑا۔ جہاں سے اب تک ایک بھی بنی ہاشم واپس نہ آیا تھا۔

(۲)

اقلیمِ دُنیا کا بادشاہ اپنے ننھے سے نُورِ نظر کو کانپتے ہوئے بازوؤں میں اُٹھا کر قتل گاہِ مومنین کی طرف چلا۔ آج وہ فقیر تھا۔ خالق کے در کا سوالی۔ مگر شام کے خُونخوار درندوں سے اپنے بیٹے کے لئے رحم کی بھیک مانگنے جا رہا تھا۔ مسلمانو! حیران کیوں ہوتے ہو؟ تم اپنے دل سے یہ وسوسہ نکال دو۔ کہ بیٹے کی محبّت اسے مکّار و زاہد فریب کے سامنے

ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر رہی تھی۔ نہیں۔ پاپ کا بیڑا بھر کر ڈوبتا ہے مشیت ایزدی بھی تھی۔ کہ یزیدی تلواریں آلِ محمدؐ کے ایک بے زبان بچّہ کے خون سے رنگی جائیں۔ اور اُن گنہگاروں کے گناہوں کا پیمانہ لبریز ہو جائے جو مادرِ گیتی کے سینہ پر ایک ناروا بوجھ سے زیادہ کچھ نہ تھے ؏

معصوم علی اصغرؑ بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتا تھا۔ اور اُن پر جو پھپھڑیاں بندھ گئی تھیں۔ انہیں لعابِ دہن سے نرم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ آہ! اُسے کیا معلوم کہ اس کی یہ سعی معصومانہ بالکل بے سود تھی۔ قطعاً بے نتیجہ۔ امام حسینؑ نے خیمہ کا پردہ اُٹھا کر باہر نظر ڈالی خیال آیا کہ کٹتی ہوئی دھوپ میں اس معصوم کو بچانے والا صرف خُدا ہے۔ دل میں قدرے تامل ہوا۔ مگر پھر شہر بانو کی یاس اُن سے دیکھی نہ گئی۔ مجبوراً خیمہ عصمت سے باہر نکلنے کے لئے قدم بڑھایا۔ مگر پھر رُک گئے۔ ماں جائی زینبؑ امام عالی مقام کے پاؤں پر سر رکھے گریہ وزاری میں مصروف تھیں۔ امام نے انہیں اُٹھا کر بٹھایا۔ اور اس گریہ کا سبب دریافت کرنے لگے۔ زینبؑ علیہا السلام نے کہا سیّدہ کا لال اماں کی ممتا بھاوج سے مجبوراً وہ کام کرا رہی ہے۔ جس کا نتیجہ سوائے زیاں کے اور کچھ نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ننھے علی اصغرؑ کی پیاس آبِ فرات سے بجھانے کی توفیق اللہ تعالےٰ نے شمر و عمر کو دی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر وہ ایسے ہی

نیک و دیندار ہوتے۔ تو آلِ محمدِ مصطفےٰ پر لشکر کشی کیوں کرتے۔ مجھے اچھے آثار نظر نہیں آتے۔ بھائی جان! خُدا اصغر کو ہزار برس زندہ رکھے۔ مگر کیا کروں۔ دِل کہتا ہے۔ کہ یہ دُعا قبول ہونے والی نہیں"۔

امام حسینؑ نے اب تک عنانِ صبر کو ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔ مگر بہن کی باتوں نے انہیں بے اختیار کر دیا۔ روتے ہوئے بولے۔ زینبؑ تم ٹھیک کہتی ہو۔ مَیں بھی جانتا ہوں۔ کہ علی اصغرؑ ہمیں داغِ جُدائی دینے والے ہیں۔ مگر خدا جو چاہتا ہے۔ وہی ہوتا ہے۔ مَیں اور تم اُس کی کارسازی میں دخل دینے والے کون"؟

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے ریش مبارک کو جو آنسوؤں سے سیراب ہو رہی تھی۔ قبا کے دامن سے پونچھا۔ اور حرم اہلبیتِ رسولؐ کے نالوں اور دعاؤں کے درمیان خیمہ سے باہر نکلے۔

(۳)

نینوا کا شاہی فقیر اپنے تشنہ لب ننھّے بچے کو گود میں اُٹھا کر وہاں گیا۔ جہاں یزیدی درندے اُس کے کمسن لختِ جگر کو معمولی پانی پلانے کی بجائے آبِ شمشیر پلانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ اوہ! دُنیا کتنی ظالم ہے۔ گردشِ ایام کس قدر بے رحم ہے۔ اور دریائے حوادث کا بہاؤ کتنا تیز ہے۔ جس نبی پاک کے نام کا کلمہ عمرو سعد جیسے جابر بھی پڑھتے تھے

اُسی کے خاندان کے ایک شیر خوار معصوم کی زندگی آج پانی کے ایک گھونٹ کی شرمندہ احسان ہو رہی تھی۔ مگر نام کے مسلمان ایک انسانی زندگی ...اِس ننھی سی جان کو اس قدر ارزاں قیمت، پر بھی بچانے کے لئے تیار نظر نہ آتے تھے۔

جب امام مظلوم نے لشکر اعدا کی چمکتی ہوئی تلواروں اور اُبھرے ہوئے نیزوں کی طرف دیکھا۔ تو یاس و نامرادی کی تصویر اُن کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ اُنہیں علم تھا۔ کہ عمر و سعد سے اپنے بچّے کی زندگی مانگنا ایک بے سُود کوشش ہے۔ مگر ضمیر کی گہرائیوں میں ایک آواز نہیں اپنا فرض ادا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ فقیر نینوا نے اپنی قبا کا دامن پھیلا کر علی اصغرؑ کے سر پر سایہ کرتے ہوئے غنیم سے کہا:۔

"عمر و سعد! تو حسین کا دشمن سہی۔ مگر مسلمان تو ہے۔ اگر مسلمان بھی نہیں۔ تو انسان تو ہے۔ ایک انسان اور صاحب اولاد ہونے کے ناطے میں اِس بے زبان معصوم کو تیرے پاس لایا ہوں۔ میرے کلیجہ کا ٹکڑا اِس دُنیا میں چند لمحوں کا مہمان ہے۔ اسے پانی کا ایک ہی گھونٹ پلا دے۔ تا کہ تجھ پر بچّہ کشی کا خوفناک الزام عائد نہ ہو۔ یہ التجا حسینؑ کی نہیں۔ عمر سعد! ماں کی ماما کا تقاضا اِس بچّے کو تیرے پاس لایا ہے دیکھ بنت علی اور سیّدہ کی بہو خیمہ عصمت کے پیچھے کھڑی تیری طرف امید و بیم کی

نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں حسینؑ تجھ سے رحم کی بھیک نہیں مانگتا۔ اُس کے لئے دینِ حقہ پر اپنی جان نثار کر دینا ہی سب سے بڑی دولت ہے لیکن اگر تیرے پہلو میں دل اور دل میں انسانیت کا پاس ہے۔ تو اس شیر خوار کی جان بچالے"۔

مگر انسانیت کہاں تھی؟ جہاں عمر و سعد جیسے حیوان رہتے ہوں وہاں انسانیت کے لئے گنجائش کہاں۔ ننھے امام زادہ کی حالت غیر کو دیکھ کر بیشتر آنکھیں خوشی سے ناچ اُٹھیں۔ اُنہیں اس وقت ہی بھیانک مسرت ہوئی۔ جو ایک گیدڑ کو جاں بلب شیر کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود عمرِ و سعد کے دل میں اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ اُسے خود یہ وسوسہ تھا۔ کہ کہیں اس یزیدی ریوڑ میں دو چار انسان نہ نکل آئیں جنہیں امامِ مظلومؑ پر رحم آجائے۔ مگر اُس کا یہ خیال غلط تھا۔ روشنی میں سیاہی کے لئے اور سیاہی میں روشنی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ اُس نے ابنِ کاہل حُرملہ کو اشارہ سے حُکم دیا۔ کہ اِس بچے کو تیر کا نشانہ بناؤ۔

قاتل کے ہاتھ حرکت میں آئے۔ اور زمین و آسمان کے دیکھتے دیکھتے معصوم علی اصغرؑ کی گردن سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ یزیدی ملعونوں نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ مگر دونوں جہاں ان کی اُس رُوسیاہی پر ہزار ہزار لعنتیں بھیج رہے تھے۔

امام مظلومؑ نے زخم کے آگے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ معلوم نہیں کیوں؟ شاید اس لئے کہ وہ اس ننھے شہید کے مقدس لہو کی ارزانی نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ چلّو بھر گیا۔ امام مظلومؑ نے بیٹے کے خون سے بھرا ہوا چلّو زمین پر پھینکنا چاہا۔ مگر اُسی وقت ایسا معلوم ہوا۔ گویا زلزلہ آیا چاہتا ہے۔ زمین بولی:۔

"امام عالیمقام! رحم کیجئے۔ اگر آلِ محمدؐ کے بے زبان شہید کا خون آپ نے میرے منہ پر پھینکا۔ تو میں ہمیشہ کے لئے بنجر ہو جاؤں گی"۔

امام مظلومؑ نے یہ چلّو بھر خون آسمان کی طرف پھینکنے کا ارادہ کیا۔ آسمان تڑپ اُٹھا۔ جیسے کہہ رہا ہو!

"شہزادہ دو جہاں! یہ خون ناحق مجھ پر نہ پھینکئے۔ ورنہ انسانوں کی دُنیا ہمیشہ کے لئے تاریک ہو جائے گی۔ اور چاند اور سورج کبھی طلوع نہ ہو سکیں گے"۔

اب امام کیا کرتے۔ انہوں نے جھٹ سے یہ خون... ننھے علی اصغر کا خون.... شہید معصوم کا خون اپنے منہ پر مل لیا۔ وہ سرخرو ہو گئے۔ سچ مچ اُن کا چہرہ اقدس علی اصغرؑ کے خون سے سرخ ہو رہا تھا... ہائے! کیا سرخروئی اسی کا نام ہے۔ کہ باپ کا منہ بیٹے کے خون سے رنگین ہو۔ خدایا پناہ!

---

# کمسن غازی

## (۱)

نزع کا وقت تھا۔ سانس دم بدم اُکھڑ رہا تھا۔ تیمارداروں کے سینوں میں دبی ہوئی آہیں۔ اور آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو یہ بتاتے تھے۔ کہ مریض پر خلد کے دروازے کھلنے والے ہیں۔

امام حسنؑ نے جن کی پیشانی پر پسینہ کے سرد قطرے چمک رہے تھے۔ اپنی نگاہیں بھائی حسینؑ کے چہرے پر جمادیں۔ حسینؑ بے اختیار ہوگئے نالہ زبان سے نکل کر فلک کی بلندیوں پر پہنچنے کے لئے بیتاب تھا لیکن انہوں نے ضبط کیا۔ چند گھنٹے بعد رونا ہی ہوگا۔ اب مُلکِ عدم کے مسافر کو آہ و بکا سے پریشان کیوں کریں۔ امام حسینؑ نے بڑے بھائیؑ کی پیشانی

سے پسینہ پونچھا۔ جیسے انہیں موت کے آہنی پنجہ کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ایک لمحہ بعد پھر وہی قطرے نمودار ہوئے حسینؑ نے ایک سرد آہ بھری۔ آہ۔ یہ موت کا پسینہ تھا۔

امام حسنؑ جانتے تھے کہ چند لمحہ بعد کیا ہونے والا ہے۔ انہوں نے اڑھائی سالہ بچے قاسمؑ کا ہاتھ حسینؑ کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ بھیا۔ میں جاتا ہوں۔ اب یہ یتیم تمہارے سپرد ہے۔

حسینؑ نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ زبان رقت سے بند ہوئی جا رہی ہے۔ جب ان کے ضبط کا بند آنسوؤں کی طغیانی کو نہ روک سکا تو حسینؑ بستر مرگ سے ذرا ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

امام حسنؑ نے بچے کو اپنے پاس بلا کر پیار سے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کے بازو پر ایک تعویذ باندھ دیا۔ اب فرزند رسولؐ کی قدم بوسی کے لئے اُس بدنصیب خاتون کی باری آئی۔ جس کی مانگ اُجڑنے میں صرف چند لمحے باقی تھے۔ امام حسنؑ نے بیوی کو قریب دیکھ کر اُسے ڈھارس بندھائی۔ اور بچے کے تعویذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "خدا تم سب کا نگہبان ہے۔ قاسم کے بازو پر جو تعویذ ہے۔ اُسے صرف اُس وقت کھولنا۔ جب تم پر انتہائی مصائب نازل ہوں"۔

فرمانبردار بیوی نے روتے ہوئے شوہر کے قدموں میں سر جھکا دیا۔

کچھ دیر بعد خانۂ رسولؐ سے اُٹھنے والے نالہ ہائے درد نے دُنیا کو بتادیا۔ کہ سیّدۂ عالم کے لختِ جگر امیر المومنین کے نورِ نظر اور رسول کریم صلعم کے فرزند مبارک امام حسنؑ اِس دُنیا میں نہیں ٭

(۲)

اِس واقعہ کے دس سال بعد قاسم کی بیوہ ماں کو اپنے شوہر کی آخری نشانی کا..... اُس تعویذ کا جو انہوں نے قاسمؑ کے بازو پر باندھا تھا۔ خیال آیا ٭

محرّم کا مہینہ تھا۔ گرمیوں کا موسم۔ چلچلاتی دھوپ تن و بدن کو جھلسائے دیتی تھی۔ اور لُو کے جھونکے کربلا کے ریگستانی خطّہ کو آتشکدہ بنا رہے تھے۔ زمین انگارے اُگلتی تھی۔ اور آسمان آگ برساتا تھا۔ سال کے اس مہیب حصّہ میں اہلبیت رسولؐ گرم گرم ریت پر خیمے ڈالے پڑے تھے۔ تین دن سے غازیوں کو پانی نہیں ملا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ حق پر ڈٹے تھے۔ اُن میں سے ایک ایک کئی کئی یزیدیوں کو خاک و خون میں لوٹا کر جام شہادت نوش کر رہا تھا۔ کئی جا چکے تھے۔ جو باقی تھے وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ رسول اللہ اور سیّدۂ عالم کی اولاد پر خود مسلمانوں نے خدا کی زمین تنگ کر دی تھی۔ ان تمام مصائب کے باوجود امام مظلومؑ کی پیشانی بارگاہِ خداوندی میں جھکی ہوئی تھی۔ اس

غریب الوطنی میں ان کے پاس کوئی متاع نہ تھی۔ تو متاعِ دین اور زیادہ سے زیادہ صبر و شکر۔ بس ؛

خاندانِ رسولؐ پر اس سے زیادہ مصیبت کا وقت اور کیا ہو سکتا تھا۔ امام حسنؑ کی بیوہ نے دیکھا۔ کہ دیور کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے اس وقت اسے اپنے شوہر کی وصیت کا خیال آیا۔ انہوں نے کہا تھا "اس تعویذ کو اس وقت کھولنا۔ جب مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں"۔ سوچا یہی وقت ہے اس تعویذ کے کھولنے کا قاسمؑ کو آواز دی۔ تیرہ برس کا لڑکا ماں کی آواز پر بھاگا بھاگا خیمہ میں آیا۔ اور بولا "اماں جان! میرے لئے کیا حکم ہے" ماں نے ان کی بلائیں لیں۔ اور تعویذ کھول کر پڑھا۔ دفعتاً تمام غم و الم کافور ہو گئے۔ ماں نے غرور سے اپنا سر بلند کیا۔ اور کہا "بیٹا!" قاسم سامنے بیٹھا تھا۔ کھسک کر قریب آ گیا۔ اور بولا "فرمائیے" ماں نے تعویذ ان کے ہاتھ میں دے کر کہا "اسے پڑھو" ؛

فرمانبردار بیٹا اپنے شہید باپ کی وصیت پڑھنے لگا۔ جوں جوں پڑھتا گیا۔ اس کا چہرہ فرط جوش سے سرخ ہوتا گیا۔ پیشانی سے جلال اور آنکھوں سے نور ٹپکنے لگا۔ ہونٹ پھڑک اٹھے۔ وصیت میں لکھا تھا۔

جان پدر!

جب تم یہ وصیت پڑھو گے۔ اس وقت تمہارے چچا

نرغۂ اعدا میں گھر چکے ہونگے۔ حق و باطل کی اس جنگ میں اولادِ عقیلؑ و علیؑ کام آئے گی۔ اور تو اور خود حسینؑ بھی شہید ہوں گے۔ اگر میں زندہ ہوتا۔ تو سب سے پہلے اپنا سر اِس قربانی کے لئے پیش کرتا۔ میں تمہیں سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس لئے میرا حق شہادت تمہیں ہی ورثہ میں مل سکتا ہے۔ تم میرے مظلوم بھائی کے کام آنا۔ اور دُنیا کو یہ بتا دینا۔ کہ اگر باپ نہیں تھا تو کیا ہُوا اس کے بیٹوں نے محضرِ شہادت پر اپنی زندگی کی مُہر ثبت کر دی۔ تمہاری والدہ اِس موقعہ پر ہمتِ مردانہ کا ثبوت دے کر تمہیں رزمگاہ میں بھیجیں گی جاؤ۔ اور اپنا حق ادا کرو۔ وقتِ شہادت تم مجھے اپنے بالیں پہ پاؤ گے"۔

قاسمؑ نے یہ وصیت ایک بار۔ دو بار۔ تین بار پڑھی۔ پھر اسے سر آنکھوں سے لگایا۔ اور کہا۔ اماں! قاسمؑ تعمیلِ ارشاد کے لئے تیار ہے اِس وصیت کے بغیر بھی وہ عمِ بزرگوار کے لئے جان لڑا دیتا لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہُوا۔ کہ دیگر شہداء پر میرا درجہ فائق رہے گا۔ اور اس کے بعد سب سے پہلے جامِ شہادت پینے کی سعادت ابن حسنؑ کو

ہی نصیب ہوگی ۔

اس کے بعد کیا ہُوا۔ تینوں بھائی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ اور اُمّ فروہ صُمّ بکم دیکھ رہی تھیں۔ ہر ایک یہ چاہتا تھا۔ کہ میدان جنگ جانے کا فخر اُسے حاصل ہو۔ بڑے نے کہا "قاسم تم ابھی چھوٹے ہو۔ بڑے بھائیوں کے ہوتے چھوٹوں کو لڑائی میں جانے کا حق نہیں" ۔

قاسم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور اس نے روتے روتے کہا۔ "مَیں چھوٹا سہی۔ مگر اس کا کیا یہ مطلب ہے۔ کہ مَیں فنونِ جنگ سے ناآشنا ہوں۔ اور میرے بازوؤں میں طاقت نہیں"۔ قاسم خاموش ہوگیا اِس مُہرِ سکوت کو توڑنے کی ہمّت کسی کو بھی نہ ہوئی۔ قاسم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "اور پھر ابّا کی سفارش بھی تو میرے حق میں رہے" ۔

دونوں بھائی اب کچھ نہ کہہ سکے۔ باپ کی وصیّت نے اُنہیں لاجواب کر دیا تھا۔ قاسم ماں سے اجازت لے کر چچا کے خیمہ کی طرف چلا ۔

(۳)

جب قاسم نے ایک میلا اور بوسیدہ کاغذ امام حسینؑ کے ہاتھ میں دیا۔ تو وہ بے اختیار رو دیئے۔ اور کہہ اُٹھے "بھیّا! کیا اپنی اِس نشانی کو آخری وقت مجھ سے چھڑاتے ہو۔ نہ۔ نہ اتنا ظلم نہ کرو" ۔

قاسم بچہ تھا۔ تیرہ سال کا سن ہی کیا ہوتا ہے۔ وہ بھی چچا کے گلے

سے چمٹ کر رونے لگا۔ انہوں نے اس کے آنسو پونچھے۔ اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ کیوں بیٹا؟"

قاسمؑ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ چچا جان آپ کو روتے دیکھ کر رہا نہیں گیا۔ آپ نے والد محترم کی وصیت پڑھ لی۔ اب مجھے ہنسی خوشی رخصت کیجئے"۔

امام مظلومؑ کا گریہ بڑھتا گیا۔ انہوں نے معصوم بھتیجے کو ساتھ لیا۔ اور امّ فروہ کے خیمے میں جا کر بولے "بھابی۔ یہ کیسا اندھیر ہے۔ کیا میری آنکھوں کے سامنے اِس معصوم کو تلواروں کی چھاؤں میں جانا ہوگا"؟

ماں کی مامتا تو یہ چاہتی تھی۔ کہ امام مظلومؑ کے سامنے بیٹھ کر فرطِ غم سے اپنے بال نوچ ڈالے۔ اور آنکھوں سے اتنے آنسو بہائے۔ کہ دریائے فرات کے کنارے ایک اور دریا بہنے لگے۔ مگر یہ رونے کا وقت نہ تھا۔ سیّدہ عالم کی نیک بخت بہو نے جی کڑا کیا۔ اور کہا۔ اے امام عالیمقام اگر آپ کے نانا کی شریعت نے عورتوں پر جہاد حرام نہ کیا ہوتا۔ تو یہ کنیز خود فرزند رسولؐ پر قربان ہوتی۔ مگر کیا کروں۔ اپنے بیٹے کی قربانی دے سکتی ہوں"۔

یہ کہہ کر امّ فروہ امام حسنؑ کا ایک عمامہ اور جناب قاسمؑ کا ایک قمیض لے آئیں۔ گریہ کناں چچا نے اپنے ہاتھوں سے یہ لباس حسنؑ کے لال کو پہنایا

اب زرہ بکتر کی تلاش ہوئی۔ چچا نے ایک ایک زرہ دیکھی۔ مگر کوئی بھی اس کمسن غازی کو پوری نہ آتی تھی۔ وہ مایوس ہو گئے اور امّ فروہ سے بولے "عرب کے سلاح سازوں کو کیا معلوم تھا۔ کہ کربلا کی جنگ میں تیرہ تیرہ سال کے بچّے بھی شہید ہونے کے لئے سینہ سپر ہونگے"۔

یہ کہتے کہتے امام عالی مقام رو دئیے۔ امّ فروہ کے پہلو میں گوشت کا لوتھڑا نہیں۔ پتھر کا ٹکڑا تھا۔ مگر اپنے لال کو اتنا غیر محفوظ دیکھ کر ان کی آنکھوں سے بھی دو بڑے بڑے آنسو نکل پڑے۔

کربلا کا ننھا سپاہی جسم پر صرف ایک حریری کرتہ پہنے اور ہاتھ میں نیمچہ لئے گھوڑے پر سوار غنیم کی طرف بڑھا۔ وہ ان لوگوں سے مقابلہ کرنے جا رہا تھا۔ جو سر تا پا آہن میں غرق تھے۔ حسینؑ نے بھتیجے کو اس طرح جاتے دیکھا۔ تو بولے "امام خلد آشیاں کا عمامہ تمہارے خود کا کام دیگا"۔

(۴)

کچھ دیر کے بعد کربلا کا میدان اللہ اکبر کے نعرۂ مستانہ سے گونج اٹھا جنگ نینوا کا کمسن غازی حریفوں کو مقابلہ کے لئے للکار رہا تھا۔ یزید کے صف بستہ لشکر نے اسے یہ کہتے سنا۔ "میں نبی مصطفےٰ صلعم کا پوتا اور زندہ انسانوں میں سب سے افضل حسینؑ بن علیؑ کا بھتیجا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ تم باطل کے علمبردار اور اسلام کے دشمن ہو۔ میں تمہاری شجاعت سے

مدافعہ کرتا ہوں۔ کہ آج عرب و مصر و روم کی فوجوں میں سے جس شخص کو بہادری پر ناز ہو۔ وہ میرے مقابلے میں آجائے"۔

یزیدی سپاہ پر سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر ہر طرف خاموشی رہی۔ پھر شام کا ایک مشہور پہلوان ازرق میدان میں آیا۔ اور بولا۔ لڑکے میرا خیال تھا۔ کہ مجھے عباسؑ یا حسینؑ سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس لئے ایک طفل نو آموز سے میں نہیں لڑنا چاہتا تھا۔ لیکن تُو نے جوانانِ شام کو مخاطب کیا ہے۔ اس لئے میرے چار لڑکوں میں سے ایک تیرا مقابلہ کریگا۔ تیار ہو جا"۔

ازرق شامی کا ایک گرانڈیل فرزند اس کمسن غازی پر حملہ آور ہوا۔ لیکن اس ننھے بہادر نے اس کا نیزہ ہاتھ میں پکڑ کر اس زور سے کھینچا۔ کہ وہ زین سے آدھا لٹک گیا۔ اب قاسمؑ کی باری تھی۔ اس نے نیمچہ سے ایسا بھرپور ہاتھ مارا۔ کہ ابن ازرق کا سر دھڑ سے الگ ہو کر زمین پر جا پڑا۔ ازرق غم و غصہ سے دیوانہ ہوگیا۔ اُس نے چاہا۔ کہ حسنؑ کے نابالغ بچے کو کچا چبا جائے۔ مگر غیرت مردانہ مانع ہوئی۔ سنبھل کر دوسرے بیٹے کو مقابلہ پر آنے کا حکم دیا۔ لیکن اِدھر وہ آیا اُدھر قاسمؑ کے نیمچہ نے حرکت کی۔ لوگ صرف نیمچہ کی حرکت دیکھ سکے اور بس۔ ازرق کے دوسرے بیٹے کی لاش بھی خاک و خون میں لوٹنے لگی۔

اس کے بعد ازرق کے دو اور بیٹے بھی ابنِ حسنؑ کے مقابل آئے

اور عدم آباد پہنچے۔ ادھر ازرق کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ شجاعت
کے اصول فراموش ہو گئے۔ بہادرانِ عرب کی روایات ذہن سے اُتر گئیں
وہ یہ بھی بھُول گیا۔ کہ ایک طفلِ نوخیز پر ہاتھ اُٹھانا جرّارِ عرب کے
شایانِ شان نہیں۔ جذبۂ انتقام سے دیوانہ ہو کر وہ کربلا کے کمسن غازی
کی طرف بڑھا۔۔۔۔ اُس تیرہ سالہ بے سلاح اور تین دن کے پیاسے
بچّے کی طرف جس نے دیکھتے دیکھتے اُس کے چاروں بیٹوں کو کیفرِ کردار
تک پہنچا دیا تھا ؁

حسینؑ کو جب یہ خبر ملی۔ تو انہوں نے اپنی پیشانی گرم گرم ریت
پر رکھ دی۔ اور فرمایا "خداوندا! یہ تو خواہش نہیں۔ کہ قاسم کی لاش
رزمگاہ سے نہ لاؤں۔ لیکن یہ دُعا ہے۔ کہ مغرور ازرق کا غرور بندۂ عالم
کے پوتے کے سامنے توڑ دے" ؁

معلوم ہوتا ہے۔ کہ خُدا نے اپنے محبوب کے محبوب فرزند کی دُعا
سُن لی۔ کیونکہ جب ازرق قاسمؑ کے سامنے آیا۔ تو اُس کے گھوڑے کا
تنگ کھُل گیا تھا۔ قاسم نے کہا "اے بہادر۔ یہ ایک مُشتاق جنگجو کے
لئے باعثِ فخر نہیں۔ کہ اُس کے گھوڑے کا تنگ کھُلا ہو۔ اور اسے
خبر بھی نہ ہو" ؁

ازرق نے گھبرا کر تنگ کو دیکھا۔ اِدھر قاسمؑ نے نیمچہ سے ایسا وار

گیا۔ کہ ارزق کی لاش زمین پر پھڑکنے لگی۔ قاسمؑ نے اس کا سر اُٹھایا اور دَوڑ کر چچا کے قدموں میں پھینک دیا۔ جو ابھی تک بارگاہِ عالی میں دستِ بدعا تھے۔

ادھر سے فارغ ہو کر قاسمؑ پھر میدان میں آیا۔ اب یزیدی لشکر کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ آن کی آن میں ہزار ہا سپاہی حسنؑ کے لال پر ٹوٹ پڑے ..... بس خاتمہ ہو گیا .....

قاسم نے جامِ شہادت پیا۔ مگر لوگ اب بھی اسے فاتح کے نام سے یاد کرتے ہیں ..... ہاں ایک کمسن بچّے کو شہید کر کے یزید کے لشکر نے عرب کی شجاعت پر ایک ایسا دھبّہ لگایا جسے شاید سینکڑوں ارزقوں اور ہزاروں یزیدوں کا خُون بھی نہیں دھو سکتا۔

# مدینہ کا چاند

(۱)

خورد سال بچّوں نے جن کے سر پر یتیمی کی سیاہ گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ باپ کی قبا کا دامن پکڑ کر کہا۔ "بابا ہمیں کس پر چھوڑ جاتے ہو؟" بیوی زیادہ حوصلہ مند تھی۔ مگر شوہر کو موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر وہ نہ رہ سکی۔ روتے ہوئے بولی "میرے سرتاج میں کیا کروں گی؟" بہن نے کہا۔ "زینبؑ تم پر قربان۔ مگر یہ تو کہو۔ کہ بھیّا نے تمہیں تیروں کی بارش میں جانے کی اجازت کیسے دے دی۔ کیا دیگر اقربا کی شہادت کے صدمے کچھ کم تھے۔ کہ انہوں نے اپنی کمر توڑنا گوارا کر لیا"۔

جواں سال بھتیجے نے کہا "عم نامدار۔ جب تک میرے دم میں دم

موجود ہے۔ آپ کو یزیدی بھیڑیوں کے رُوبرو نہ جانے دوں گا۔ اگر فرات پر جانا ضرور ہے۔ تو یہ خدمت میرے سپرد کیجئے"۔

بڑے بھائی نے کہا: "عباسؑ۔ میرا سینہ غم و اندوہ کے مارے پھٹا جاتا ہے"۔

اور خیامِ حسینی ٹھنڈی سانسوں۔ دلدوز چیخوں اور آسمان شگاف نالوں کے شور سے گونج اُٹھے۔ آج حسینؑ کا فدائی۔ علیؑ کا شیر معصوم سکینہ کا سقّہ۔ شاہ کم سپاہ کا دستِ راست۔ اور عساکرِ حسینی کا علمدار معراج شہادت حاصل کرنے جا رہا ہے۔ آج بھائی بھائی پر جان قربان کر کے چچا بھتیجی کی پیاس بجھانے کے لئے لہو کی بوندوں کو قطرات آب کی طرح بہانے جا رہا ہے۔ فرشتے اُس پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ اور حوریں جنت میں اُس کی منتظر۔ آسمانی مخلوق زبانِ حال سے پکار رہی ہے۔ زندہ باد عباسؑ۔

(۲)

جب نالوں کا کچھ شور تھما۔ تو عباسؑ نے بی بی سکینہؑ سے مخاطب ہو کر کہا: "اُٹھو بی بی۔ اپنے چچا کو رخصت کرو۔ میں جانتا ہوں۔ کہ مارے پیاس کے تمہارا دم لبوں پر ہے۔ لیکن فکر آب ہی مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ ساقی کوثر کی پوتی سے اُس کی سوکھی ہوئی مشک طلب کروں

اور فرات کے لبالب کناروں تک پہنچنے کے لئے خونِ اشقیا کی ندی بہا دوں"۔

آنسوؤں سے لبریز رُخسار زرد پڑ گئے۔ ہونٹوں پر آئے ہوئے نالے رُک گئے۔ سینہ پھاڑ کر نکلنے والی چیخیں گلے میں پھنس گئیں۔ پردیسیوں کا قافلہ عباسؑ نامدار کا منہ تکنے لگا۔ سکینہؑ بھولے پن سے اُٹھی۔ اور اپنی مشک ... خشک لب خشک .... ننھے علی اصغرؑ کے ہونٹوں کی طرح خشک ... کھونٹی سے اُتار لائی .... چچا نے فرطِ محبت میں اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ اور بولے "بی بی تمہارا سقہ جاتا ہے بارگاہِ الٰہی میں دُعا کرنا۔ کہ تمہارے بابا کے خادم کی عزت رہ جائے۔ اور وہ تین دن کی پیاسی آلِ رسولؐ کو پانی سے سیراب کر سکے"۔

حضرت عباسؑ سبز پھریرا اُڑاتے ہوئے خیمہ سے باہر نکلے۔ تو دیکھا۔ کہ دشمنانِ سیاہ دل خیام عصمت و طہارت کی طرف بڑھے چلے آتے ہیں۔ اور شہزادۂ کونین امام ہمام اور حضرت علی اکبرؑ انہیں پسپا کرنے میں مصروف ہیں۔ حضرت عباسؑ نے ملاعنہ کی طرف گھوڑا بڑھایا اور فرمانے لگے "او بدبختو۔ شانِ امامت میں یہ گستاخی۔ بھاگنا مت۔ میں ابھی تمہیں اِس حرکت کا مزہ چکھاتا ہوں۔ خبردار۔ موت سر پر آ پہنچی۔ اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یا بھاگنے کے لئے"۔

شیرِ علی کی آواز میں رعد کی سی گرج تھی۔ گھوڑے بدکتے گئے۔ پیادہ سپاہ کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ شیاطین کے ہاتھوں سے تلواریں چھوٹ گئیں۔ فوجِ شام سراسیمہ ہو کر ماہرِ غازی کا مُنہ تکنے لگی۔ علمدارِ رسولؐ کے بیٹے نے کہا: "ہاشمی تلواریں نیام سے نکل آئیں۔ غیرتِ آلِ رسول جوش میں آ گئی۔ کفرستانِ عرب میں نعرۂ توحید بلند کرنے والے مولا کے فرزند سر ہتھیلی پر لے کر آ پہنچے۔ ہم وہ ہیں۔ جنہوں نے عاضریہ کی اسی زمین پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اور درِ جنت پر دق الباب کر کے دم لیا۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ اور گناہ سے توبہ کرو۔ ورنہ تیغِ عباسی تمہاری امیدوں اور آرزوؤں کا خُون کئے بغیر نیام میں واپس نہ جائے گی"۔

اِس رجز کو سُن کر مارو آگے بڑھا۔ لیکن اِس حال میں کہ چہرے پر ہوائیاں چھُوٹ رہی تھیں۔ اور گھبراہٹ میں تلوار کی بجائے نیزہ ہاتھ میں تھا۔

(۳)

مارو کا دِل خوف کے مارے انجن کے پسٹن کی طرح دھڑک رہا تھا۔ لیکن بظاہر ہنس کر بولا: "اے نوجوان مجھے تیری جوانی اور تیرے بانکپن پر رحم آتا ہے۔ جا اپنی ماں کی گود خالی نہ کر۔ اپنی دُلہن کے سُہاگ میں آگ نہ لگا۔ خُدا کی قسم۔ مجھے کبھی کسی پر رحم نہیں آیا لیکن تیری جواں سالی

دیکھ کر تجھ پر وار کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جا بہادرانِ شام کے غضب کے شعلوں کو ہوا نہ دے۔ کہ ان کی ایک چنگاری بھی تیرے خرمنِ جان کو پھونک دینے کی طاقت رکھتی ہے"۔

عباس علمدار کی آنکھیں غصہ کے مارے خون کبوتر ہوگئیں۔ تڑپ کر بولے "او مردود۔ تو واپس جانے کے لئے کسے کہتا ہے۔ اُسے جس کے پدر بزرگوار نے بدر و حنین کے معرکوں میں اشقیا کے دانت کھٹے کر دئے؟ اُسے جسے شجاعت گھٹی میں ملی؟ اُسے جس نے دشمن کو مارنا سیکھا۔ لیکن اپنی جان کے خوف سے راہِ فرار اختیار کرنا نہ سیکھا۔ سن لے اور کان کھول کر سن لے۔ کہ مَیں فاتح خیبر کا جگر بند ہوں۔ آفتاب اپنی جان چھوڑ سکتا ہے۔ چاند اپنے مقام سے ہٹ سکتا ہے۔ ستارے شب کی سیاہی میں پیٹھ دکھائے۔ یہ ناممکن۔ اگر تیرے دست و بازو میں طاقت ہے۔ تو وار کر۔ اگر جان عزیز ہے۔ تو جا۔ اُس دوزخی کُتے عمر و سعد کو بھیج دے"۔

مارد بولا "صاحبزادے۔ اتنی چرب زبانی اچھی نہیں۔ اگر زندگی سے بیزار ہے۔ تو تلوار میان میں رکھ دے اور نیزہ سنبھال۔ کیونکہ مَیں جلدی میں نیزہ ہی اُٹھا لایا ہوں۔ پھر مَیں تجھے اس بڑے بول کا مزہ چکھا دونگا"۔

عباسؑ نے ہنس کر کہا "ہم دشمن کی عاجزی و مجبوری سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ مَیں تلوار نیام میں رکھے لیتا ہوں۔ تُو وار کر۔ اگر عباس تجھے تیرے

ہی ہتھیار سے خاک و خون میں نہ ملا دے تو کہنا"۔

یہ کہہ کر علمدار غازی نے اپنی تلوار نیام میں رکھ لی۔ عباسؑ کو نہتہ پا کر مارد نے نیزے سے وار کیا۔ جونہی نیزے کی نوک اُن کے قریب پہنچی۔ شبیر علی نے اُسے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اور اس زور سے کھینچا۔ کہ اگر مارد نیزے کو ہاتھ سے چھوڑ نہ دیتا۔ تو گھوڑے پر سے زمین پر آ رہتا۔ عباس نامدار نے اُسی کے نیزے سے ایک بھرپور ہاتھ رسید کیا۔ تیر گھوڑے کی پیٹھ کو چیرتا ہوا زمین کو چھونے لگا۔ رہوار زمین پر گر پڑا۔ اور اُس کے ساتھ مارد بھی خاک نشیں ہو گیا۔ مارد گھبرا اُٹھا۔ اب اُسے موت اپنی آنکھوں کے آگے رقصاں نظر آنے لگی۔ اُس نے چلا کر کہا "میری موت سے پہلے گھوڑا میرے پاس پہنچا دو۔" اُسی وقت ایک حبشی غلام ایک بادرفتار رہوار لے کر حاضر ہُوا۔ لیکن حضرت عباسؑ ایک ہی جست میں اُس کے پاس پہنچ چکے تھے انہوں نے نیزے سے غلام کو دوزخ میں پہنچا دیا۔ اور خود اپنے گھوڑے سے کُود کر طاریہ پر سوار ہو گئے۔ یہ وہ گھوڑا تھا۔ جو شیر خدا نے امام حسینؑ کو عطا فرمایا تھا۔ لیکن بعد ازاں ایک شامی قبیلہ اُسے چُرا لے گیا تھا۔



(۴۹)

طاریہ پر سوار ہو کر عباس نے کہا "او ملعون اب وار بچا۔ دیکھ۔ تیرا ہی گھوڑا ہے۔ اور تیرا ہی نیزہ۔" یہ کہہ کر انہوں نے ایک ہاتھ ایسا مارا۔ کہ

مارو کی لاش پھڑکتی نظر آنے لگی۔ اشقیائے سیاہ دل اپنے سردار کی یہ حالت دیکھ کر عباس نامدار پر پل پڑے۔ اور سینکڑوں تلواریں ایک... صرف ایک غازی کا قلع قمع کرنے کے لئے میانوں سے نکل آئیں۔ بلا کا معرکہ ہوا لیکن انجام کار تیغ عباس ظفر مند ہوئی۔ یزیدی گنتے اُن کے بے پناہ حملوں کے رُوبرو نہ ٹھہر سکے۔ اور جان بچانے کے لئے بھاگنے لگے ✦

عباسؑ گھوڑے کو ایڑ لگا کر نہر کی جانب جانا چاہتے تھے۔ کہ زیارتِ امام کی خواہش نے بے قرار کر دیا۔ گھوڑا دوڑا کر بھائی کے پاس پہنچے اور بولے "آقا دیکھئے۔ یہ رہوار مارو کی مدد نہ کر سکا۔ لیکن میرے اشارہ پر کنوتیاں بدلتا ہے" ✦

امام ہمامؑ نے فرمایا "بھیا۔ کیوں نہ ہو حسنؑ بھائی کا گھوڑا ہے۔ مخالف اسے چرا لے گئے۔ اب تمہاری شجاعت کے انعام میں تمہیں مل گیا" ✦

بھائی سے رخصت ہو کر عباس خیمہ کی طرف گئے۔ بیبیاں انہیں دیکھ کر رونے لگیں۔ ان کی شریکِ حیات تو رو رو کر بیہوش ہوئی جاتی تھیں۔ شاید شیر علیؑ اُن کی تسکین کے لئے کچھ دیر اور وہاں ٹھہرتا۔ لیکن باہر سے صدا آئی "عباس پہنچو۔ دشمن نے ہمیں گھیر لیا ہے" ✦

"سکینہ کے بہشتی۔ اللہ نگہبان" اُس خاتون نے جس کی مانگ

عنقریب اُجڑنے والی تھی حسرت بھرے لہجہ میں یہ الفاظ کہے لیکن عباس جواب دئے بغیر دوڑے آقا و مولا کی جان خطرے میں تھی۔ پھر وہ بی بی کے زخم دل پر مرہم رکھنے کے لئے خیمہ میں کیسے بیٹھ رہتے +

(۵)

لڑتے بھڑتے۔ فصیل کو توڑتے۔ تلواروں کی صفوں کو درہم برہم کرتے اور اشقیائے شام کے خون کی ندی بہاتے ہوئے عباس دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا۔ دُور دُور تک دشمنوں کا نام تک نہ تھا۔ ایک جمعیت بدحواس ہو کر بھاگ رہی تھی۔ کچھ افراتفری میں دریا کے پار ہو گئے تھے۔ اور کچھ میدانِ وغا میں بہادروں کی سی موت مرنے کی بجائے فرات کے گہرے پانیوں میں ڈوب رہے تھے۔ سقائے سکینہؑ نے بھتیجی کی خشک مشک دریا میں ڈال دی۔ اور لجام طاریہ ڈھیلی چھوڑ دی۔ کہ یہ گرمی اور پیاس ہانپنے والا جانور پانی پی سکے۔ لیکن طاریہ۔۔۔ امام حسنؑ کا رہوار تھوتھنی اوپر اُٹھا کر بھوں کا توں کھڑا رہا۔ گویا زبانِ حال سے کہہ رہا تھا۔ آقا آلِ رسول پیاسی ہو اور میں اپنی پیاس بجھا لوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رہوار اور سوار دونوں دریا سے پیاسے لوٹے۔ مگر سقائے سکینہؑ کے ایک بازو پر بھتیجی کا پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ لٹک رہا تھا +

یکایک شور اُٹھا اور بھاگنے والے سپاہی عباس علمدارؑ کی

طرف آتے دکھائی دئے۔ شمر کہہ رہا تھا: "اگر یہ مشک خیام حسینی میں پہنچ گئی تو قیامت ہو جائے گی"۔

سقائے سکینہؑ کو جان سے زیادہ مشک عزیز تھی۔ گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ کہ کسی نہ کسی طرح سکینہ کی امانت اُس کے حوالے کر دیں لیکن صف بند دشمنوں نے راستہ روک لیا۔ عباسؑ کے ایک بازو پر مشک لٹک رہی تھی۔ اور دوسرے سے تلوار چلا رہے تھے۔ کسی شقی القلب نے برادر امام کی اس مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر ایک بازو پر وار کیا! اور وہ جسم پاک سے علیحدہ ہو کر زمین پر جا پڑا۔ اِس کڑیل جوان نے مشک دوسرے بازو پر لٹکا دی اور اسی ہاتھ سے تلوار چلانے لگے! ایک طرف یہ زخمی شیر تھا۔ ایک بازو سے محروم۔ خون میں لت پت اور کمزوری سے نڈھال دوسری طرف ہزاروں گیدڑ۔ عباس کا دوسرا بازو بھی کٹ گرا۔ تو انہوں نے مشک کا تسمہ دانتوں سے مضبوط پکڑ لیا۔ اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ لیکن کہاں تک۔ ایک ملعون نے تیر تاک کر مشک میں مارا۔ اور فرات کا وہ قیمتی پانی جسے شہزادہ علی نے اپنا خون دے کر حاصل کیا تھا۔ خون عباسؑ کے ساتھ ساتھ زمین پر بہہ گیا۔ اسی وقت حکم بن طفیل نے عباسِ مجبور کے فرقِ مبارک کو گرز سے پاش پاش کر دیا۔ عباس لڑکھڑا کر گھوڑے سے گرے۔ اور بس ... سب ختم ہو گیا۔

(۶)

## امام حسینؑ کا دل خون ہو کر بہہ گیا.....

نظارہ نہایت خوفناک تھا۔ آہ۔ کیا انسانیت اِس قدر ذلیل ہو سکتی ہے؟ بنی ہاشم کا بانکا خاک و خون میں پڑا تھا۔ اور وہ بُزدل جنہیں زندگی میں اُس کے قریب آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اُس کی لاش پر تلواروں اور بھالوں کی ضربات لگا لگا کر اپنے انتقام کی شیطانی آگ بُجھا رہے تھے ؛

امام عالیمقام رو دیئے۔ کیوں نہ روتے۔ اُن کا بازو کٹ گیا تھا۔ کمر ٹوٹ گئی تھی۔ علی کا بیٹا۔ امامِ وقت کا بھائی۔ سکینہ کا بہشتی انہیں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ جن و ملائک۔ حیوان و انسان۔ چرند پرند سب جس کی یاد میں آنسو بہا رہے تھے۔ اُسے حسینؑ کیوں نہ روتے۔ لاش کے قریب پہنچ کر یزیدی کُتّوں کی حیوانیت کا منظر دیکھ کر امام ہمامؑ کو غش آ گیا۔ جب ہوش آیا۔ تو پیارے عباس سے لپٹ کر دھاریں مار مار کر رونے لگے۔ نقاہت کے باعث بھائی کو قبر میں اُتارنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اُسے سپرد خدا کر کے چلے۔ اور کہتے گئے "علیؑ کے شیر۔ تم میری امانت ہو۔ میرے بعد اب سید سجاد ہی تم کو ہاتھ لگائیں گے۔ فرشتوں کی صفیں تمہارا پہرہ دینگی۔ اور حوروں کا غول تمہارا طواف کریگا ؛

"یہاں تک کہ اسیرِ مظلوم کے ہاتھ تمہیں قبر میں اتار دیں" +
خیمہ طہارت میں جب بیبیوں اور بچوں نے عباسؑ کی بجائے
ان کے سبز پھریرے میں لپٹی ہوئی خشک مشک دیکھی۔ تو روتے روتے
بے حال ہو گئے۔ آج خیمہ طہارت کی بیبیوں نے پہلی مرتبہ یہ کہا کہ
اب ہم بے ردا ہو گئی ہیں +

مدینہ میں جب اُمّ البنین نے بیٹے کی شہادت کی خبر سُنی تو یاس و
حسرت سے بُت بدیوار بن گئیں۔ اُنہیں یقین نہ آتا تھا۔ کہ عباسؑ بھی
قتل ہو سکتا ہے۔ لیکن موت کی خبریں بہت کم غلط ثابت ہوتی ہیں۔
جب شہادت عباسؑ کی خبر کی تصدیق ہو گئی۔ تو وہ دیوانوں کی طرح
اُٹھیں۔ اور بقیع میں جا کر بین کرنے لگیں۔ جب تک زندہ رہیں۔
بقیع سے یہ صدا راہ گیروں کے دِل چیرتی رہی "آہ عباسؑ آہ۔ بیٹا" +
خاندان رسالت کے دشمن بھی وہاں سے گزرتے۔ تو رو دیتے
تھے۔ عورتیں بچے بُوڑھے اور جوان اُمّ البنین کے نالے سُن کر قبرستان کی
دیوار سے سر پھوڑ لیتے اور کہتے "اماں۔ صرف تم نے ہی اپنا بیٹا نہیں
کھویا۔ بنی ہاشم نے اپنا محبوب کھو دیا ہے۔ مدینہ کا چاند غروب ہو گیا
ہے۔ اور اسے صرف تمہیں نہیں رو تیں۔ سارا شہر اُس کی یاد میں
آنسو بہاتا ہے" +

# حسینؑ کی آخری مناجات

(۱)

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بارِ خدا
ہیں برابر تیری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطرِ عاشقِ جانباز ہے اللہ سوا
اے خوشا حال جو ہو مجھ سے ترا عشق سوا
حلق پہ تیغ چلے سینہ پہ جلاد رہے
لب پہ ہو نام ترا دل میں تری یاد رہے

(۲)

وہ کلیجے پہ دھرے ہاتھ پڑے ہیں اکبرؑ

ہیں وہ عباسؑ دلاور اور حسنؑ کا دلبر
ایک ایک پیارے کو قربان کیا گن گن کر
کی امانت میں خیانت نہ ذرا اے داور
جو امانت کہ تھی مجھ خاک نشیں کو سونپی
وہ امانت تری بندہ نے زمیں کو سونپی

(۳)

سب میرے نورِ نظر قتل ہوئے پیشِ نگاہ
بندہ نے شکر کیا اور کہا اِنّا لِلّٰہ
جبکہ ہو مرضی معبود سے بندہ آگاہ
پھر ستم پر جو ستم ہوں نہ کرے مُنہ سے آگاہ
آگے کہتا تھا نہ عُریاں سرِ خواہر دیکھوں
پر جو تو خوش ہو تو زینبؑ کو کھلے سر دیکھوں

(۴)

قتل اکبرؑ تو مرا ہو چکا آنکھوں کے حضور
اب اگر تجھ کو نہ ہو نسلِ امامت منظور
قتل عابد کو کر دوں آپ ہیں بانو کے حضور
میں خلیل اور ذبیح ہوا تیرا مشہور

ہاتھ رُک جائے گلے پر تو قلم ہاتھ کروں
ہاتھ سے ذبح کروں لب سے مناجات کروں

(۵)

بندہ پرور ہوں میں ایک بندہ غریب و احقر
بیکس و بے وطن و بے پدر و بے مادر
منزلِ ملکِ عدم میں تو میرا ہو رہبر
نہ تو اُس راہ سے آگاہ نہ منزل سے خبر
شوق ایک عمر سے مجھ کو تیری درگاہ کا ہے
سامنا بندۂ ناچیز کو اللہ کا ہے

---

# انوکھا فریادی

(۱)

سب کی نگاہیں ناقہ سوار کی طرف اُٹھ گئیں۔ جو ملول صورت اور دبدبۂ حیدری کے ساتھ خراماں خراماں میدانِ جنگ کی طرف چلا آتا تھا.... اُس رزمگاہ کی طرف جو اِس سے پیشتر اس کے تمام عزیزوں اور رفیقوں کے خون سے سیراب ہو چکی تھی۔ اور اب اس آخری شہید کے لہو کا گھونٹ بھرنے کے لئے آنے والے نازک لمحات کی منتظر تھی:۔

ناقہ سوار نے غنیم کے بالمقابل آ کر کہا۔ ''میں بلند قامت ناقہ پر سوار ہو کر آیا ہوں۔ اِس لئے نہیں۔ کہ میرا سرِ پُر غرور اپنے آپ کو بنی نوعِ انسان سے بلند و برتر دیکھنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ تم میں سے ہر شخص مجھے

دیکھ لے اور میری آواز سُن سکے۔ شافع محشر کے اہل و عیال کی عزت آبرو خطرہ میں ہے۔ کیا تم میں کوئی ایسا ہے۔ جو حرم رسولؐ اِس آفت کو دفع کردے"۔

میدانِ جنگ میں سناٹا چھا گیا۔ اگرچہ اِس طویل و بسیط میدان میں خلقِ خدا کا اژدحام تھا۔ پرستارانِ توحید کا جمِ غفیر تھا۔ اُن مسلمانوں کی کثرت تھی۔ جو دن میں کم از کم پانچ مرتبہ لاالہ اللہ محمد رسول اللہؐ کا ورد کرتے تھے۔ تاہم اس وقت کوئی بھی رسولؐ خدا کے نواسے کی التجائے فرد قبول نہ کرسکا۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ علیؑ کا شیر میدانِ جنگ میں جیتے جاگتے سپاہیوں سے نہیں۔ بلکہ قبرستان میں زیرِ لحد پڑے ہوئے مُردوں سے مخاطب ہو رہا ہے۔

امام ہمامؑ نے یہ حالت دیکھی۔ تو اپنی پُرنم آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھائیں۔ فرمایا "میرے خداوند! میں حُجّت پیش کرچکا۔ گواہ رہیو۔ کہ حسینؑ نے ادائے فرض میں کوتاہی نہیں کی۔ اس کے بعد لوگوں نے ناقہ سوار کو خیام عصمت و طہارت کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ حرم کی بیبیوں سے آخری مرتبہ رخصت ہوتے جا رہا تھا۔

(۲)

الوداع اور پھر آخری الوداع ... کتنا خوفناک لفظ ہے اور

اسے سُنتے ہی انسانی دِل و دماغ پر جو کیفیت طاری ہو جاتی ہے! بس اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جنہیں اپنے محبوب سے دائمی جدائی اختیار کرنے کی کوفت اُٹھانی پڑی ہو۔

"اہلبیت رسولؐ کو ابن رسول کا آخری سلام"۔

یہ الفاظ تھے۔ جنہوں نے حرم کی بیبیوں کو تڑپا دیا۔ زینبؑ و ام کلثوم کے آہ و بکا اور معصوم سکینہؑ کی دلدوز چیخوں سے وہ کہرام بپا ہوا۔ کہ الامان۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا آسمان ابھی پھٹ پڑیگا۔ جب رونے دھونے سے فُرصت ملی۔ تو جناب فضّہ اُٹھیں۔ اور انھوں نے اس حالت میں کہ ان کے سینہ سے آہوں کا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ بصد مُشکل یہ فرمایا۔

"یا ابن مُصطفےٰؐ آپ پر سیّدۂ عالم کی باندی کا بھی حق ہے۔ اسے بھول نہ جائیے۔ وقتِ رحلت آپ کی مادر گرامی نے فرمایا۔ کہ جب میرا لال اُمّت کے لیئے سر دینے جائے۔ تو اُس کی بلائیں لینا اور میری جگہ اُس کے سر و پا کو بوسے دینا"۔

امام مظلومؑ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے! وہ فاطمہ کا لال یہ کہتے ہوئے فضّہ کی طرف بڑھا۔۔۔ "تم ماں کی جگہ ہو اور ماں کا درجہ سب سے بلند ہوتا ہے حسینؑ کی یہ طاقت کہاں۔ کہ ماں کے حُکم کو ٹھکرا دے"۔

جناب فضّہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جب انہوں نے

شیر علیؑ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اُس وقت درد و کرب کے مارے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ سب دم بخود..... سانس رُکے ہوئے اِس الم انگیز نظارہ میں کھو چکے تھے۔ اور باطن کی آنکھیں فضہؑ کے قالب میں خاتونِ جناں کا جلوہ دیکھ رہی تھیں..... خود شہزادۂ کونین کے دیدۂ پُرنور بھی اپنی والدہ دُخترِ رسولؐ کی یاد آتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔

جنابِ فضہؑ نے ٹوٹتے ہوئے دِل اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ وہ فرض ادا تو کیا۔ جو اگر سیّدۂ عالم بقیدِ حیات ہوتیں۔ تو وہ انجام دیتیں۔ مگر اُنہیں امام ہمامؑ کو آخری رُخصت دینے کا حوصلہ نہ ہُوا۔ بال کھولے اور دیوانوں کی سی صورت بنا کے سینہ کوبی کرنے لگیں۔ زہرہؑ کے نُورِ نگاہ نے جب یہ کیفیّت دیکھی۔ تو خود آگے بڑھے۔ اور بولے "فضہ۔ سورۂ دہر اہلبیت علیہم السلام کی مانند تمہاری تعریف میں بھی رطب اللسان ہے۔ پھر تمہاری یہ حالت کیوں؟ جنّت میں نانا رسولِ خداؐ میرے منتظر ہیں۔ امّاں خاتونِ جناں اپنا آغوش کھولے میری راہ دیکھ رہی ہیں۔ بابا علیؑ شہیدِ کربلا کے سر پر عمامۂ شہادت دیکھنے کو بیتاب ہیں۔ اور تم دیر کر رہی ہو۔ جاؤ۔ میرے لئے ایک جامۂ کہنہ لاؤ۔ جسے میں سلاحِ جنگ کے نیچے پہن سکوں"۔

ابنِ رسولؐ کی بات سُن کر فضہؑ کو ہوش آیا۔ اُف.. وہ ایک ضروری

فرض کی تکمیل کو بھول ہی گئی تھیں۔ مگر اس میں ان کا کیا قصور۔ حسین کو گھڑی بھر کا مہمان دیکھ کر اگر انہیں دُنیا و مافیہا کی سُدھ نہ رہی۔ تو اس کے لئے ان کا جذبۂ ایمانی اور عشق دینی سزاوار تھا نہ کہ فاطمۃ الزہراؑ کی مجبور و معذور لونڈی۔ فضہ نے تبرکات کی ایک گٹھڑی نکالی۔ اور اس میں سے رسولِ کریمؐ کی ایک قبا نکال کر امام حسینؑ کے حوالے کی۔ فضہ نے کہا۔ فاطمہؑ کے لال۔ یہ قبا آپ کے نانا کی ہے۔ خاتونِ جنا کی باندی کربلا کے شہید کو تن پوشی کے لئے اس سے بہتر لباس نہیں پیش کر سکتی"۔ امام ہمام نے قبا کو سر آنکھوں سے لگایا۔ اسے جا بجا بوسے دئے اور احترام کے ساتھ اسے زیبِ تن کرتے ہوئے فرمایا"۔ فضہ۔ میں سمجھ گیا۔ تم نے یہ قبا مجھے اس لئے دی ہے۔ کہ یزیدی مسلمان اگر اور کسی وجہ سے نہیں تو کم از کم رسولِؐ خدا کے پاس خاطر سے اس پر دستِ ستم دراز نہ کریں گے۔ لیکن تم بھولتی ہو فضہ مسلمان آج پہلے سے مسلمان نہیں رہے۔ خیر۔ یہ میری خوش نصیبی ہے۔ کہ نانا کا لباس اِس مسافرِ عدم کو راحتِ سفر کے طور پر مل گیا۔ مگر دِل کہتا ہے۔ کہ یزیدی بھیڑیئے اِس قبا کو بھی نہ چھوڑیں گے! ور ابنِ رسولؐ کا لاشہ صحرائے کربلا میں برہنہ و بے کفن نظر آئیگا"۔

یکا یک خیمۂ عصمت و طہارت سے ایک صدائے نالہ بلند ہوئی! ور گریہ و زاری کے شورِ محشر کے درمیان رسول کا نواسہ اہلبیت رسولؐ سے

ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ٭

(۳)

اگر خداوند تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور نہ ہوتا۔ تو مجاہد کربلا کی تقریر میں اتنا گداز ضرور تھا۔ کہ جمعیت شہداء ایک بار پھر تیغ و تفنگ ہاتھوں میں لے کر دفع باطل کے لئے حسینؑ کے دوش بدوش دکھائی دینے لگتی۔ امام بولتے تھے۔ اور اُن کے مُنہ سے چنگاریاں نکلتی تھیں۔ الفاظ انگارے بن بن کر قلوب اعدا پر برس رہے تھے۔ اور ساری کی ساری تقریر ایک آگ تھی ... دبی ہوئی نہیں سُلگتی ہوئی آگ غنیم کے سپاہی سُنتے تھے اور ندامت کے مارے زمین میں گڑے جاتے تھے۔ خطیب منبر سلونی کے فرزند نے آج میدان جنگ کو ایک بھری پڑی محفل بنا دیا تھا ... ایسی محفل جہاں برچھیوں کا کام الفاظ سے لیا جاتا ہے ٭

امام فرما رہے تھے ... مسلمان آج یہود و نصاریٰ سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔ اگر خرِ عیسیٰ نصاریٰ کے ہاتھ آتا تو وہ اسے اپنا معبود سمجھتے۔ اور اگر عصائے موسیٰ یہود کے پاس ہوتا۔ تو وہ شب و روز اس کی پرستش کرتے لیکن مسلمان ... رسول نامدار کے مسلمان اپنے پیغمبر کی اولاد کے درپے آزار ہیں۔ جانتے ہو۔ یہ یکہ و تنہا مظلوم کون ہے۔ ہاں ذرہ کون ہے جس کا خون پینے کے لئے اُمت رسولؐ کی تلواریں میانوں میں

تڑپ رہی ہیں۔ وہ کون ہے۔ جس پہ خُدا کی زمین تنگ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے؟ دوشِ رسولؐ کا راکب سرورِ کونین کا نواسہ۔ فخرِ مریم خاتونِ جناں کا جگرپارہ۔ آلِ ہاشم میں سے نہیں حوضِ کوثر کے ساغر سے بجھانا چاہتا ہوں جس پر اہلبیت اور ہر محبِ اہلبیت کا حق ہے۔ مَیں شہادت سے نہیں ڈرتا لیکن تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں۔ کہ منعمِ حقیقی کے انتقام سے بچو۔ اور اس آگ سے ڈرو۔ جو تمہارے اجسامِ قوی و قلوبِ سیاہ کو اپنا ایندھن بنانے کے لئے تمہاری طرف لپک رہی ہے۔ مَیں روضۂ نبیؐ کا مجاور تھا۔ تم نے مجھے نانا کی تربت سے جُدا کر دیا۔ مَیں نے معبدِ خلیل میں امان طلب کی۔ مگر تمہارے خونخوار بھیڑیے ابنِ رسولؐ پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے وہاں بھی پہنچے۔ تمہاری درخواستوں پر مَیں نے کوفہ کا رُخ کیا۔ مگر تم نے سرِراہ میرے بھائیوں۔ بھتیجوں اور جواں بیٹوں کو شہید کر دیا۔ بتاؤ۔ کیا آبِ فرات تمہاری پیاس بجھانے میں ناکام رہا ہے۔ کہ تم فرزندِ نبیؐ کے خون سے اپنے ہونٹوں کو سیراب کرنا چاہتے ہو۔ تمہاری غیرت کیا ہوئی۔ تمہاری اُلفتِ رسولؐ کس ملعون نے چھین لی۔ تمہارے نورِ ایمان سے روشن سینوں میں کُفر کی تاریکی کیونکر داخل ہو گئی! اچھا جانے دو۔ مَیں اب بھی داورِ محشر کے رُوبرو تمہاری شکایت نہ کرونگا۔ تمام خون معاف کر دونگا۔ یہ بھی بھول جاؤنگا۔ کہ تمہارے ناپاک ہاتھ ننھے علی اصغرؑ

کے خون سے آلودہ ہیں۔ مجھے اجازت دو۔ کہ ناموسِ رسولؐ خاندان بنت الرسولؐ کی حرماں نصیب بیواؤں مُردہ پسر ماؤں اور محروم برادر بہنوں کو لے کر نانا کے مزار پر چلا جاؤں اور باقی عمر حسب سابق روضۂ نبیؐ پر چراغ جلانے اور اشکوں کے نذرانے دینے میں گزار دوں۔ بولو۔ بولو۔ کیا کہتے ہو"؟

اگر یزیدی سالارِ فوج عمر بن سعد کے سینہ میں ایک پتھر کا ٹکڑا ہوتا تو وہ بھی پگھل جاتا۔ لیکن اُس کا قلب سیاہ نارِ جہنم کے تاریک شعلوں سے بنا تھا۔ وہ ہنسا اور بولا۔ "ابن علیؑ۔ ہم مسجد نبوی میں نواسہ رسولؐ کا وعظ سُننے ہیں نہیں آئے۔ یہ رزمگاہ ہے۔ یہاں تلوار کے جوہر دکھانے ہونگے۔ تُم سے اتنی رعایت کی جا سکتی ہے۔ کہ تم تین سوال کرو۔ اُن میں سے ایک ضرور پورا کر دیا جائیگا۔ ہم قرابت رسولؐ کے ناطے تُم پر اتنی مہربانی کر سکتے ہیں"۔

(۴)

شہزادۂ کونین کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ملعون عمر سعد نے انہیں بھکاری سمجھا تھا۔ جی میں آئی۔ کہ ابھی اسے اِس گستاخی کا مزہ چکھا دیں۔ لیکن دِل نے کہا۔ "حسینؑ! ٹھہر۔ تجھے ان اشقیاء پر حجت خدا ختم کرنی ہے۔ تیرے عجز کا امتحان ہے۔ اِس میں پورا اُترنا ہوگا"۔

امام مظلومؑ نے غُصّہ ضبط کر کے کہا: "مجھے روضۂ نبیؐ پر جانے دے"۔
یزید کا زرخرید غلام غوث سے بولا: "نہیں۔ یہ نہیں ہونے کا"۔
ساقیٔ حوضِ کوثر کے فرزند نے کہا: "تو مجھے ایک گھونٹ پانی پلا دے۔
کہ اعزا کی دائمی جُدائی۔ تین یوم کی پیاس اور کڑکتی دھوپ نے میرا
جگر کباب کر رکھا ہے"۔
عمرِ سعد نے کہا: "جنہوں نے چھ ماہ کے بچّہ پر ترس نہ کھایا۔ وہ
کہن سال حسینؑ پر رحم کیوں کرنے لگے"۔
زہرہ کا لال متانت سے بولا: "یہ بھی نہیں۔ تو اپنے جوانمردوں کو
حکم دے کہ ایک ایک کر کے میرا مقابلہ کریں۔ یہ انصاف سے بعید
ہے کہ فوج کی فوج یکہ و تنہا سیّد زادے کو ذبح کر ڈالے"۔
یزیدی سپہ سالارِ اعظم کی زبان بند ہو گئی۔ اُس کا دماغ کہہ رہا تھا
"عمرو۔ اگر یہ درخواست بھی ٹھکرا دی۔ تو لوگ کہیں گے۔ عمرو سعد
بزدل تھا جس نے ہزار ہا بہادروں کو تنہا حسینؑ پر چھوڑ دیا"۔ وہ انکار نہ
کرسکا۔ جنگ شروع ہوئی۔ امام حسینؑ نے عساکرِ یزید میں کھلبلی ڈال دی
یزید کے بڑے بڑے شہ زور سوار عمیم بن قحطبہ۔ جابر قمی وغیرہ جہنم داصل
ہوئے۔ جب بدر ابن سہیل یمنی کی باری آئی۔ تو امام ہمامؑ محض مدافعتی
تدابیر کرنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا نیزہ ٹوٹ گیا۔ تلوار کند ہو گئی

اور اُس کے ترکش میں ایک بھی تیر باقی نہ رہا۔ اُس وقت علیؑ کے شیر نے تلوار کا ایک ہاتھ ایسا مارا۔ کہ تیغِ برّاں ڈھال اور فولادی خود کو چیرتی ہوئی بدر کے سر پر پڑی۔ اور وہ بھی اپنے شقی القلب رفقاء کے ساتھ جا ملا +

عمرسعد اب تک اپنے وعدے پر قائم تھا۔ مگر بدر کی موت اُس سے دیکھی گئی۔ اُس نے بیک وقت فوج کو سیّد الشہداء پر حملہ بولنے کا حکم دیدیا۔ اس وقت جو لوگ امام ہمامؑ کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اُن کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے کیا کم ہوگی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد بدحواس یزیدوں نے دیکھا کہ ساقیٔ کوثر کا فرزند گھوڑا دوڑاتا ہوا ساحلِ فرات کی طرف جا رہا ہے +

(۵)

حیرت کا مقام ہے۔ جس پانی کے لئے طفلِ ششماہہ ہدفِ ناوک بنا۔ جس کی طلب پر رسولؐ زادے نے اپنے کڑیل جوان فرزند کو جنت میں آبِ کوثر کے جام کا وعدہ فرما کر مایوس لوٹا دیا۔ جس کی خواہش پر سکینہؑ جیسی معصومہ کو یاد دلایا گیا۔ کہ امام زادوں کی پیاس ہی اسے روزِ محشر دخترانِ مسلمین کی شفاعت کے قابل بنادے گی۔ آج شہزادہ عالم اس پانی کو چلّو میں لے کر اپنے رہوار سے کہہ رہے تھے وہ جب تک میں نہ پیوں تو اپنی پیاس نہ بجھائیگا۔ اچھّا۔ مَیں بھی پیتا ہوں تو بھی پی" +

امام ہمامؑ کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ یہ پانی نہیں زہر ہے جس آب

فرات کے لئے اُن کے بھائی بھتیجے اور بیٹے تڑپ تڑپ کر شہید ہوئے تھے
اُس سے امام عالی مقام اپنی زبان کیسے تر کرتے۔ وہ پانی کی طرف دیکھتے
تھے۔ گویا وہ جلتے ہوئے انگارے ہیں۔ جن کے مس کرتے ہی زبان پر چھالے
پڑ جائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود باوفا گھوڑے کو دکھانے کے لئے وہ
اپنا ہاتھ اُن خشک ہونٹوں تک لے ہی گئے۔ جو کبھی رسولؐ کی بوسہ گاہ تھے
یزیدی بھیڑیوں نے سمجھا۔ کہ شیر علیؑ سچ مچ اپنا حلق تر کیا چاہتا ہے۔ اس
تصور نے ہی اُن کے سامنے اپنے مستقبل ایک بھیانک تصویر پیش کر دی
عالم تشنگی ہی میں حسینؑ نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اگر اُس کی
پیاس فرو ہو گئی تو ہمارے استخوان بھی نظر نہ آئیں گے۔ یہ سوچ کر اُن
میں سے حصین ابن نمیر ملعون نے دُور سے تاک کر ایک ایسا تیر مارا کہ
سبطِ رسولؐ کے ہونٹ زخمی ہو گئے۔

اسی اثناء میں شمر کی آواز آئی "حسینؑ پیو۔ خوب پانی پیو۔ اور
ہمارے سپاہیوں کو جو تمہاری عورتوں کے خیموں میں گھس گئے ہیں۔
لوٹ مار کا موقعہ دو"۔

غیرت حسینی ان جملوں کی متحمل نہ ہو سکی۔ فاطمہؑ کے لال نے اپنے
تشنہ لب رہوار کی عنانِ خیمہ عصمت و طہارت کی طرف موڑ دی۔ دفورِ
غضب سے کانپتے ہوئے خیمہ میں داخل ہوئے۔ لیکن وہاں دشمن کے

سپاہیوں کا نام ونشان نہ تھا۔ اُلٹے پاؤں پھرنا چاہتے تھے۔ کہ امام ابن امام کو خُون میں نہائے دیکھ کر بیبیوں نے گھیر لیا۔ اور کہا۔ "بہت ہو چکی۔ اب ہمیں فرزند رسول کو ان بیرحم قصائیوں کے جم غفیر میں نہ جانے دینگی"۔

امام بیٹھے تھے۔ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بولے۔ "کیا تُم چاہتی ہو کہ وہ ملعون میری حیات میں اہلبیت رسولؐ کی بے حُرمتی کریں۔ نہیں جب تک میں زندہ رہوں۔ ایسا نہیں ہوگا"۔

(۶)

حسینؑ قہر خدا بن کر عساکر اشقیا کی جانب روانہ ہوئے۔ لوگ کہیں گے۔ کہ چالیس ہزار کے سامنے یکہ وتنہا کی کیا حقیقت۔ لیکن نہیں۔ جب تک علی کے شیر نے دشمن پر یورش کی۔ تو یزیدی کُتّے اپنی اپنی جان لے کر بھاگنے لگے۔ حسینؑ ایک ایک سوار کو دو دو ٹکڑے کر دیتے مارتے تھے اور تیغ امام اس طرح چل رہی تھی۔ جیسے فلک پر لاتعداد بجلیاں بیک وقت تڑپ رہی ہوں۔ دفعتاً الامان کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اور اس غور و غُل کے درمیان حضرت کو ہاتف کی یہ صدا اُسنائی دی۔ یاایھا النفس المطمئنۃ ارجعوا الی ربک راضیۃ مرضیۃ"۔

اے نفس مطمئنہ۔ اب پالنے والے کی طرف واپس ہو جا۔ اِس

حالت میں کہ وہ تم سے راضی ہؤا۔ اور تو اس سے خوشنود ہو"۔
امام عالی مقام کا سر تسلیم اپنے مولا کے حکم سے خم ہو گیا۔ کہاں تو تلوار کے جوہر دکھا رہے تھے۔ کہاں اب زمین پر ہی بیٹھے بیٹھے سر بسجدہ ہو گئے۔ اور زیر لب کہنے لگے "پروردگارا! یہ زندگی تیری امانت ہے۔ میں نے یہ جنگ تیرے لئے ہی کی تھی حسینؑ کی یہ ہمت کہاں۔ کہ امانتدار کی امانت واپس کرنے سے انکار کر دے۔ حسینؑ ہر حال میں برضا خدا ہے"۔
ادھر زبان امام مالک کون و مکان سے مخاطب تھی۔ اُدھر اشقیا نے فرصت پا کر اس قدر تیر برسائے۔ کہ جسم امام چھلنی ہو گیا۔ جب دیکھا۔ کہ شیر بے دست و پا ہو گیا ہے۔ تو قریب آ کر شمشیر وغیرہ سے وار کرنے لگے۔ یکایک ایک ایسا تیر لگا۔ کہ دوش رسولؐ کا سوار جھک کر خاکِ کربلا کی آغوش میں جا پڑا۔ زمین کانپ اُٹھی۔ آسماں کو لرزش ہوئی۔ نصف النہار کا آفتاب غصہ کے مارے آگ اُگلنے لگا۔ خُدا کی خدائی نے انسانوں کی احسان فراموشی۔ بیدردی اور ستم شعاری کو دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ آہ انسان ... اور انسان بھی مسلمان کیا اتنا ذلیل ہو سکتا ہے۔ کہ اپنے پیغمبر اپنے شافع کی اولاد کے ساتھ لڑتا ہؤا بالکل درندہ بن جائے؟

اشقیا کے نیزے اسی شہیدِ نیم جاں کے جسمِ پاک میں داخل ہو لئے
آہ جسے حبیبِ خُدا گودی میں کھلاتے اور جبرئیلؑ جس کا جھولا جھلایا کرتے
تھے۔ اسے کربلا کی تپتی ہوئی ریت پر تیروں اور تلواروں نے تھپک تھپک کے
سُلایا جا رہا تھا۔ حضرت امامؑ کی حالت غیر تھی۔ اُس وقت خولی اصبحی نے
اُن کے سینہ میں تیر مارا۔ جو سینہ میں جا کر لگا سبطِ رسولؐ نے بے اختیار
اسے باہر کھینچ لیا۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ اُف! اُس کے ساتھ فرزند نبیؐ کا کلیجہ
بھی نکل آیا۔ خُون اِس کثرت سے بہنے لگا۔ کہ امام ہمامؑ کی قبا رنگین
ہو گئی۔ انہوں نے خُونی فوارے کو ہاتھ پر روکا۔ اور اپنے خون سے
ریش مبارک کو خضاب کر کے اشقیا کی طرف دیکھا۔ اور فرمایا " اچھا۔
اب اِسی طرح نانا سے مُلاقات کرونگا۔ اور کہونگا۔ کہ اپنی اُمّت کی
کارگزاریاں مُلاحظہ فرمائیے "۔

فریاد نرالی تھی اور فریاد ہی انوکھا۔

# حضرتِ حُسین علیہ السّلام

ہاں اے قتیلِ جور و جفا اے شہیدِ حق
لاریب تو صفِ شہداء میں ہے کامیاب
ہوں گے کبھی نہ محوِ یزیدی ستم
پلٹے زمانہ لاکھ جہاں میں ہوں انقلاب
صحرائے ہولناک بھی گلزار ہو گیا
قطرے تیرے لہو کے بنے لالہ و گلاب
کہتے ہیں صاف صاف شہادت کے واقعات
فرزند فاطمہؑ تجھے اے جانِ بوتراب
ہے تربتِ شہید زیارت گہِ جہاں

اے چشمِ شوق دید ہے اس کی بڑا ثواب
کیا اقتباسِ نور کا نورِ خدا سے ہے
ہر ذرّہ کربلا کا ہے مہتاب و آفتاب
گر چشمِ التفات ہو مرزا کے حال پر
چمکے ستارہ اُس کا بھی اوجِ کمال پر

فدا

---

## فلسفہ آلِ محمدؐ حصّہ دوم

مصنفہ علامہ ابن حسن جارچوری۔ یہ کتاب محتاجِ تعارف نہیں۔ اس کا مضمون اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن ہندوستان میں شائع ہو چکے ہوئے ہیں۔ چونکہ پاکستان میں اس کی بہت کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے اس کی اشاعت کا ہم نے انتظام کیا تھا۔ قیمت فی جلد ۸عہ

## رسالہ معراجیہ

مصنفہ مولانا مولوی سید حشمت علی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ معراج شریف کے واقعہ کے متعلق تمام اعتراضات کا جواب۔ قیمت صرف ۵ر

ملنے کا پتہ

مینیجر کتب خانہ اثنا عشری لاہور۔ مُغل حویلی

# قیامت کا دن

## (۱)

کتنا دردانگیز منظر تھا۔ وہ! وہ جس کے لئے خازنِ جنت درزی بنا تھا۔ اپنی نصیبوں جلی بہن کے درِ خیمہ پر کھڑا کہہ رہا تھا۔ ماں جائی! ایک دن ماں خاتونِ جناں نے ہمیں عید کے دن حُلّہ جنّت پہنایا تھا! اب تم ان کی جگہ ہو۔ بھائی کو نانا کی قبا پہناؤ۔ اور اسے رُخصت کرو۔ روؤ نہیں بہن۔ حسینؑ کو وہاں بھیج دو جہاں سقّائے سکینہؑ جیسے شیر مرد۔ علی اکبرؑ جیسے کڑیل جواں اور علی اصغرؑ جیسے طفلِ معصوم گئے ہیں۔ شُدنی یہی ہے رضائے الٰہی یہی ہے۔ ہم اس میں مخل کیوں ہوں۔ جلدی کرو"۔

حضرت زینبؑ نے تبرکات میں سے رسولؐ خدا کی قبا تلاش کی اور

اسے بھائی کو پہنا کر زار زار رونے لگی۔ امام حسینؑ بھی آبدیدہ ہوگئے اور حسرت بھرے لہجہ میں بولے "میں جانتا ہوں خواہر! اب یہ یتیم تمہارے سپرد ہیں۔ میں نے انہیں بڑے ناز سے پالا تھا میرے بعد ان کی دلجوئی کرنا۔ زینبؑ کی چیخیں نکل گئیں۔ آج مطلعِ سادات کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ آج فاطمۃ الزہراؑ کا لال ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا تھا۔ آج امامِ جہاں کی شہادت کا وقت قریب تھا۔ اگر بہن اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکی۔ تو یہ اُس کا نہیں۔ اُس کی محبت کا قصور تھا۔ اُس کے دِل کا قصور تھا۔ جو بچوں۔ بھتیجوں اور بھائیوں کی دائمی مفارقت کا غم دیکھنے کے بعد اب حسینؑ کی جُدائی برداشت نہ کر سکا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ عاشقِ دین کی آنکھوں سے دجلہ و فرات بہنے لگے۔ گویا یہ آنسو تھے۔ نہیں خون کی ندی تھی۔ اسی ٹوٹے ہوئے سوتے کی . . . غم سے نڈھال امام بہن کی یہ حالت دیکھ نہ سکے۔ اور اپنے راہوار پر سوار ہونے کے لئے بڑھے لیکن یہ کیا جسم میں اتنی سکت بھی نہیں۔ کہ کسی کی مدد کے بغیر گھوڑے پر سوار ہو سکیں سینہ سے ایک آہ نکل گئی۔ اور سبطِ رسولؐ نے یاس و حسرت سے پکارا "عباسؑ بھیا۔ کہاں ہو تم؟" بہن بھائی کی یہ بیکسی و ناتوانی دیکھ نہ سکی تڑپ کر بولی۔ اگر اجازت ہو تو میں گھوڑے کی باگ تھام لوں۔ اگر کوئی نہیں۔ تو یہ دکھیا بہن تو زندہ ہے۔ اِس کی زندگی کس کام آئے گی"۔

امام مظلوم کا دل کٹ کر خون ہو گیا۔ کیا شہزادی عالم کی بیٹی بے پردہ ہو گئی؟ وہ بولے "زینبؑ میں جانتا ہوں۔ کہ میرے بعد کیا ہوگا۔ سادات کی بہو بیٹیوں پر جو گزرے گی۔ اسے میری آنکھیں ابھی دیکھ رہی ہیں لیکن میری زندگی میں خیمہ سے باہر نہ آنا۔ اس سے میری حمیت کو ٹھیس لگے گی"۔ دختر فاطمہؑ کا اٹھا ہوا قدم وہیں رُک گیا۔ وہ چپ چاپ در خیمہ کی چلمن کے پیچھے کھڑی رہی۔ چپ چاپ آنسو بہانے کے لیئے ؛

(۲)

امام دوجہاں بصد مشکل گھوڑے پر سوار ہوئے۔ اور باگ ہاتھ میں تھام کر اسپ وفادار کو میدان جنگ کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ لیکن رہوار جوں کا توں کھڑا رہا۔ اس نے بھی ذرا حرکت نہ کی۔ امامؑ نے کہا۔ بھاری ساری دنیا نے حسینؑ کو چھوڑ دیا۔ کیا تو بھی اس کی رفاقت ترک کرنے پر آمادہ ہے۔ میں جانتا ہوں۔ کہ تجھے کئی دن سے آب و دانہ نہیں ملا۔ لیکن یہ حسینؑ کی آخری سواری ہے۔ اپنے مظلوم و بدنصیب آقا کو شہادت گاہ میں پہنچا دے پھر تیرے مصائب کا بھی خاتمہ ہو جائیگا" ؛

یہ کہہ کر فرزند رسولؐ نے اس کے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ یہ کیا؟ امام دوجہاں کے ہاتھ پانی سے تر ہو گئے۔ آہ بے زبان جانور آنسو بہا رہا تھا۔ اس نے وفادارانہ انداز میں سر ہلایا۔ اور خاموش نگاہوں سے اپنے دشمنوں کی طرف

اشارہ کیا۔ امام مظلومؑ نے جھک کر دیکھا۔ تو صابرہ کی پوتی اور صابر باپ کی بیٹی گھوڑے کے پاؤں سے لپٹ رہی تھی حسینؑ نے کہا "بیٹی۔ میری منزل کو کٹھن نہ بناؤ۔ یاد کرو اپنا وعدہ تم نے صبر کرنے کا وعدہ کیا تھا"۔

چھوٹی سی ننھی بچّی سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ اور بولی "اباجان! اب پیاس برداشت نہیں ہو سکتی خدا کے لئے دو گھونٹ پانی پلا دیجئے۔ پھر میں آپ کو نہ روکوں گی۔ کبھی نہ روکوں گی"۔

امام حسینؑ کا دل خون ہو کر بہہ گیا۔ انہوں نے علی اصغر کی پیاس آبِ تیغ سے بجھانا قبول کر لیا تھا لیکن بیٹی کی التجا رد نہ کر سکے۔ گھوڑے سے اُتر آئے اور اسے گود میں اُٹھا کر خیمہ کے پچھلی طرف لے گئے۔ وہاں حضرت نے زمین میں نیزہ گاڑ دیا۔ جب اِسے نکالا۔ تو صاف شفاف آبِ فرات سے بھی زیادہ صاف پانی کا چشمہ اُبل پڑا۔ امام دوجہان بولے "بیٹی ایک طرف یہ پانی ہے۔ دوسری طرف اُمّتِ محمدؐ کی لڑکیوں کی شفاعت۔ بولو۔ دونوں میں سے کونسی چیز پسند ہے"؟

زہرہؑ کی پوتی نے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اور کہا۔ بابا مجھے دُختران اُمّت کی شفاعت قبول ہے۔ مَیں پانی نہ پیونگی پیاسی ہونگی اور اگر اللہ کو منظور ہوا۔ تو پیاسی دم توڑوں گی"۔

اب حضرت نے نیزے کی ایک ٹھوکر سے چشمہ بند کر دیا۔ اور بچّی کو زینبؑ کے سپرد کر کے دلدوز نالوں اور بلند آہنگ چیخوں کے درمیان شہادت گاہ کی طرف چلے ؎

(۳۲)

کربلا کی جھلسنے والی لُو اور کڑکتی ہوئی دھوپ میں امام مظلومؑ چالیس ہزار اشقیا کے رُوبرو جا کھڑے ہوئے۔ عباسؑ کی موت نے ان کے بازو چھین لئے تھے۔ اور علی اکبرؑ کی شہادت نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ اور زبان .... پیاس کے مارے خُشک ہو رہی تھی۔ لیکن حضرت نے اللہ تعالےٰ کی آخری حجّت کو پُورا کرنے کے لئے غنیم کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے اہلِ شام و کوفہ! مَیں اُس رسولؐ کا دلبند ہوں" جس کا تم کلمہ پڑھتے ہو۔ مَیں اُس ماں کا بیٹا ہوں۔ جس کے مہر میں ساری دُنیا کا پانی ہے۔ مَیں وہ ہوں جسے رسولِ خداؐ نے اپنے دوش پر سوار کیا۔ اور زبان مبارک سے سردار جوانانِ بہشت کا خطاب دیا تمہیں ان قرآنوں کی قسم جو تم نے اپنے گلے میں حمائل کر رکھے ہیں۔ رسول کے اصحاب سے پُوچھو کہ میرا دعوےٰ درست ہے یا غلط۔ تم نے سادات کا گھر تباہ کر دیا۔ تم نے رسولؐ کی اولاد کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ اب تم میری جان کے درپے ہو۔ سوچو ایک تین دن کے پیاسے کو قتل کرکے

تمہارے ہاتھ کیا آئیگا۔ ڈرو خدا کے انصاف سے۔ اور اس کے رسول کے قہر سے جب قیامت کے دن پروردگارِ عالم تم سے یہ سوال کریگا۔ کہ تم حسینؑ کے جد کا کلمہ پڑھنے والوں نے میرے حبیب کے نواسے کو شہید کیوں کیا۔ تو اُسے کیا جواب دو گے۔ میرا قافلہ لُٹ گیا۔ میرے جوان بیٹے۔ بھائی اور رفقاء خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں تمہیں معاف کرنے کو تیار ہوں۔ صرف اِس شرط پر کہ مجھے مدینہ منوّرہ جانے دو۔ تاکہ میں نانا کے مزار کا مجاور بن کر اپنی زندگی کے دن ختم کر دوں۔ روضہ رسولؐ پر چراغ جلایا کروں۔ اور اس وقت تک یہ عمل جاری رہے۔ تا وقتیکہ میرا چراغِ حیات گُل نہ ہو جائے۔ اگر یہ بھی منظور نہیں۔ تو اِس بہتّر گھنٹے کے پیاسے کو خطۂ ہند میں جانے دو۔ تاکہ میں کسی گوشہ میں بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ یادِ الٰہی کر سکوں ٭

فرزندِ رسولؐ کی تقریر ختم ہو گئی۔ اس وقت سب خاموش تھے۔ یکایک لشکرِ غنیم سے ایک تلخ ہنسی کی آواز آئی۔ اور کسی نے کہا۔ حسینؑ تم امام بھی ہو۔ ابن امام بھی ہو۔ رسول و بنتِ رسولؐ کے جگر کے پارے بھی ہو۔ لیکن مجبور ہو کر عذر و التجا کرنے لگے ہو۔ ہمیں تمہارے سبطِ رسول ہونے سے انکار نہیں۔ لیکن بغاوت سے باز آؤ۔۔۔۔ اور یزید کی اطاعت قبول کرو۔ تمہارا کوئی بال بھی بھیکا نہ کر سکے گا" ٭

شیر خدا کے فرزند کے دل میں غصہ کی دبی ہوئی آگ بھڑک اُٹھی۔ کڑک کر بولے "کیا میں مجبور ہوں؟ نامردو! اچھا اب میری قوت بازو کا تماشا بھی دیکھ لو"۔ یہ کہہ کر صدیقہ طاہرہ کا شیر چالیس ہزار گیدڑوں سے جا بھڑا۔ ہتھیار بند جوانوں کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں۔ فرزند رسولؐ کی تلوار جدھر گرتی پرے کے پرے صاف کر دیتی۔ کرایہ کے ٹٹوؤں میں بھاگڑ پڑ گئی +

ابن سعد نے تمیم کو اُکسایا اور کہا۔ مردود تیری پہلوانی کس روز کام آئے گی۔ دیکھ علیؑ کا بیٹا یکہ و تنہا ساری فوج کو ذبح کئے ڈالتا ہے۔ تمیم مظلوم کربلا کے مقابل آیا۔ مگر تیغ کے ایک ہی وار سے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ جابر کے فرزند کا بھی یہی حال ہوا۔ اس کے بعد اسم بامسمیٰ جابر خود حملہ آور ہوا۔ اور درد بھرے لہجہ میں بولا "یا حسینؑ! تم نے میرے جوان بیٹے کو قتل کر کے مجھ پر خواب و خور حرام کر دئے۔ اب غم نصیب کی تلوار اُس وقت میان میں جائے گی۔ جب انتقام پورا ہو جائیگا"۔

امام حسینؑ ایک پھیکی مگر پُر معنی ہنسی ہنسے اور بولے "جانتے ہو۔ تمہارا مقابلہ کس سے ہے۔ اُس سے جو اپنے دل پر اٹھارہ بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں کے داغ کھا چکا ہے۔ لیکن انتقام! .... انتقام تو وہ پالنہار لیگا۔ حسینؑ راضی برضا ہے۔ اور خالق موجودات کی رضا کے لئے

لڑ رہا ہے۔ ہاں۔ اگر تیرے بیٹے کے دل میں حملہ کی حسرت رہ گئی ہو۔ تو مجھ پر وار کر۔ میں تیغِ علیؑ کو جنبش نہ دونگا۔

جابر نے پہلے بھالے سے وار کئے۔ جب وہ ٹوٹ گیا۔ تو تلوار سنبھالی اور جب تلوار بھی ریزہ ریزہ ہو گئی۔ تو تیر برسانے لگا۔ لیکن شیر خدا کے بیٹے نے اس کے تیر تلوار سے کاٹ دیئے۔ اب امام دو جہاں کی تیغ حرکت میں آئی۔ ہر طرف خون برسنے لگا۔ سر بھٹے کی طرح اُڑنے لگے اور اشقیا بے دین الامان الامان پکار اُٹھے۔

(۴)

حسینؑ نے فرات کے کنارے پہنچ کر گھوڑا روک لیا۔ اور رہوار سے کہا۔ اب تو پیٹ بھر کر پانی پی لے۔ ہم تو بابا کے ہاتھ سے ساغر کوثر ہی پئیں گے۔ لیکن گھوڑے نے پانی کی طرف رُخ نہ کیا۔

اُنیس سو ملاعنہ کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد امام مظلوم پانی تک پہنچے تھے۔ لیکن جب سقائے سکینہ کی شہادت اور ششماہے کی پیاس یاد آگئی۔ تو گھوڑے سے اُتر نہ سکے۔ اس وقت غنیم کے لشکر میں سے تیروں کی بوچھاڑ ہوئی۔ مبادا فاطمہؑ کا لال اپنی پیاس بجھانے کے بعد ایک بار پھر قیامت صغریٰ بپا نہ کر دے۔ اس پر حضرت کو پھر جلال آیا۔ اور انہوں نے نیزے سے دشمنوں کے سر کاٹ کر فضائے کربلا

میں اُچھالنے شروع کر دیئے۔ بزدلوں نے پھر الحفیظ الحفیظ کے نعرے بلند کیئے۔ اُدھر غیب سے صدا آئی کہ "یا سبطِ رسول! آپ کا کام پُورا ہوا۔ اب ہاتھ روک لیجئے۔ تیغ کو میان میں رکھیئے۔ اور خوشی خوشی سر کٹائیے۔ تا کہ اللہ کی رضا پُوری ہو"۔

سرتاج الشہداء نے اُسی وقت وار بند کر دیئے۔ اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر کہا۔ میرے مالک تو جس حال میں رکھے حسینؑ اسی میں راضی ہے اب یہ ہاتھ اِن بے دینوں پر نہ اُٹھیں گے۔

اس وقت صرف زبان اور دل سے نہیں۔ بلکہ جسم پاک پر تین سو نو زخموں سے بھی یہی صدا نکل رہی تھی۔ اور محمد مصطفےٰؐ کا جگر بند عبادت الٰہی میں مصروف تھا۔ دشمنوں نے امام ہمامؑ کو غافل پا کر ان پر یورش کی اور نہتے امام پر جس کی اب بروئے حکم الٰہی میان میں تھی۔ تیروں کی بارش ہونے لگی۔ سیّد الشہداء نے بآوازِ بلند پکار کر کہا۔ کہاں ہیں عباسؑ کیا ہوئے حبیب ابن مظاہر؟ کہاں گئے۔ میرے جاں نثار؟ ارے۔ مجھ پر تیر برس رہے ہیں۔ اور تم خاموش ہو۔

اسی وقت لبیک لبیک یابن رسول اللہ کی صدائیں بلند ہوئیں اور شہداء کے لاشے تڑپ کر رہ گئے۔ صدائے امام بیمارِ کربلا کے کانوں میں بھی پہنچی۔ باپ کی ندائے درد سُن کر بیٹا بسترِ علالت سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اور ایک خیمہ کی چوب ہاتھ میں لے کر باہر نکل آیا۔ پھوپھی کے روکنے پر بھی نہ رُکا۔ امام نے سیّد سجاد کو باہر آتے دیکھا۔ تو تڑپ کر بولے وہ نہیں۔ تم وہیں ٹھیرو۔ بیٹا خیمہ سے باہر نہ آؤ۔ ورنہ دُنیا آلِ محمدؐ سے خالی ہو جائے گی۔ ہمارے بعد امامت کا فرض تم پر ہے۔ جاؤ۔ اپنے بستر پر لوٹ جاؤ۔

اُسی وقت ایک تیر آ کر حضور کی پیشانی پر لگا۔ دلبندِ رسولؐ گھوڑے کی پُشت سے زمین پر آ رہے۔ غم نصیب بہن۔ اس نظارہ کی تاب نہ لا سکی دیوانہ وار باہر نکل آئی۔ اور ڈھاریں مار کر بولی وہ ہائے میرا سیّد جان سے جا رہا ہے۔ میرا ماں جایا کوئی دم کا مہمان ہے۔ ہٹ جاؤ۔ ظالمو۔ کیا تم مسلمان ہو۔ تمہارے رسولؐ کا نواسہ یوں ذبح ہوتا ہے۔ اور تم کھڑے تماشہ دیکھتے ہو۔ ہٹ جاؤ۔ اور مجھے بھائی کے پاس آنے دو۔ پانی نصیب نہیں۔ میں اپنے آنسو چھڑک کر فاطمہؑ کے جگر گوشے کو ہوش میں لاؤں گی۔ میں اسے اپنے خشک و پریشان گیسوؤں سے ہوا کروں گی چھوڑ دو اسے خُدا کے لئے رسولؐ کے لئے۔

امام غیورؑ زخموں سے نڈھال تھے۔ جب ذرا ہوش میں آئے تو بہن سے بولے جاؤ میری ماں جائی حسینؑ کی قسمت میں شہادت لکھی ہے۔ لیکن تم خدا کے لئے خیمہ میں چلی جاؤ۔ میری آنکھیں خواہر کو

بے پردہ نہیں دیکھ سکتیں +

وقت آخر بھی امام سے سرتابی ناممکن تھی۔ بہن روتی پیٹتی پھر خیمہ میں چلی آئی +

(۵)

اس وقت ایک بچہ .... معصوم خورد سال بچہ ماں سے دامن چھڑا کر شہادت گاہ میں بھاگ آیا .... اور امام کے بالیں پر آ کر بولا۔ اچھے عمو۔ خیمہ میں چلو۔ پھپھی اپنے بال نوچ رہی ہیں۔ اور بہن سکینہ نے رو رو کر آنکھیں سرخ کر لی ہیں۔ اور پھوپھی۔ اوہ یہ تو ہلکان ہوئی جاتی ہیں۔ چل کر خیمہ میں ان کی خبر لو +

امام مظلوم آنکھوں میں آنسو بھر کر جس میں خون پاک کی دھاریں بھی چھپی ہوئی تھیں۔ بولے۔ نہیں بیٹا اب خیمہ میں جانے کی فرصت نہیں "

لیکن بچہ وہیں کھڑا رہا۔ اور جب اشقیا تلواریں سونت کر اس کے ذی وقار چچا کی طرف بڑھے۔ تو اس نے کہا۔ تم دیکھتے ہو۔ کہ چچا کا جسم زخموں سے چھلنی ہو رہا ہے۔ پھر اور ظلم کیوں کرتے ہو۔ ان کو چھوڑ دو ظالمو ہم تمہارا دیس چھوڑ دیں گے۔ ہم چچا کو لے کر نانا کے دیس چلے جائیں گے۔ ان کو مت مارو۔ خدا کے لئے نہ مارو +

لیکن وحشی درندوں کے سینہ میں گوشت کے دل نہیں۔

پتھر کے ٹکڑے تھے۔ تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ امام دو جہاں پر پڑا۔
کمسن بچے نے چچا کو بچانے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ ان کے
جسم پر رکھ دئے۔۔۔۔ اور دوسرے ہی لمحہ اس کے ننھے ننھے ہاتھ
زمین پر کٹے پڑے تھے۔ اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا
اس وقت شقی القلب دشمن کے ایک اور وار نے اس معصوم کو ہمیشہ
کے لئے خاک پر سلادیا۔ عالم نزع میں حسینؑ اس سے لپٹ گئے اور
بچے کا خون آلودہ عمامہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے فضا میں بلند
آواز کرکے کہا "میرے مالک اب تو حسینؑ سے راضی ہوا۔ اس معصوم
کا خون تیری راہ میں حسینؑ کا آخری ہدیہ ہے۔ اسے قبول کر۔ یہ بچہ
کون تھا۔ عبداللہ بن حسنؑ۔ شہزادہ قاسم کا چھوٹا بھائی۔ امام سے
یہ شہادت دیکھی نہ گئی فرطِ رقت و درد سے ماں کو پکارا۔ اسی
وقت خاتون جنت کی نورانی شکل نگاہوں میں پھرنے لگی۔ بنت
رسول نے کہا۔ بیٹا۔ اب حد ہو چکی۔ میں ابھی پایۂ عرش ہلاتی ہوں۔
یہ دنیا۔۔۔۔ گنہگاروں کی دنیا!۔ لیکن حسینؑ نے مادرِ مہرباں کو
روک لیا۔ اور کہا اماں خدا کے لئے سر کے بال نہ کھولو۔ ورنہ
تمہارے بیٹے کی سب محنت اکارت جائے گی ؞

نماز عصر کا وقت قریب تھا۔ حضور مصروف نماز ہوئے اور

نماز کی حالت میں ہی۔۔۔۔ شمر ملعون نے خنجر گردن پر رکھ دیا۔ بہن کانپ اُٹھی۔ آسمان لرزنے لگا۔ آندھیاں چلنے لگیں۔ آفتاب سیاہ ہو گیا۔ جنات و ملائک کو یہ گمان ہونے لگا۔ کہ قیامت کا دن آپہنچا۔ زینب تڑپ کر بھائی کی نعش پر گری۔ اور بولی "ہائے! آج بنی ہاشم یتیم ہو گئے"۔

---

# نورِ ایمان

## تو ترمیم

یہ کتاب فنِ مناظرہ کا گلدستہ، دلائل و براہین کا مجموعہ، تہذیب و متانت کا نمونہ، حُسنِ بیان کا آئینہ اور شیعہ سُنی اختلافات کا فیصلہ ہے۔ اسکے مؤلف عالیجناب محامد نساب خان بہادر مولوی سید خیرات احمد صاحب وکیل گیا ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ شیعہ تصانیف میں سے یہ کتاب ۴ بار چھپکر مومنین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے لیکن اب کی دفعہ مؤلف ممدوح نے نظرِ ثانی فرما کر مضامین و دلائل کی زیادتی سے اسکی شان کو دوبالا کر دیا ہے۔ اسکا حجم اب کی دفعہ ۵۰۰ صفحات ہو گیا ہے اور کاغذ و طباعت کی خوبیاں دل کو کشش کرتی ہیں۔ قیمت عہ؍ مجلد ڈائی دار ۶ ؍ہے۔

# کاروانِ بیکساں

(۱)

باہر قیامت بپا تھی۔ اور اندر رسولِ کریم صلعم کی بہو بیٹیاں خیموں کے پردوں سے جھانک کر کربلا کا خونیں تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ روتے روتے آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے۔ مگر دل کی دھڑکن لحہ بہ لحہ تیز ہو رہی تھی۔ دُور دُور سے لب کھُلتے تھے۔ مگر اُن سے بجائے چیخوں کے آہیں نکلتی تھیں۔ جب مصائب کی انتہا ہو جائے۔ تو انسان کی زبان گُنگ ہو جاتی ہے یہی کیفیت اُن غریب الوطن بیبیوں کی تھی۔ جو ٹکٹکی باندھے مجروح و ناتوان حسینؑ کی آخری کشمکش دیکھنے میں ایک کرب انگیز خلش کا احساس کر رہی تھیں۔

دفعتاً خولی کے نیزہ پر فاطمہؑ کے لال کا سر نظر آیا۔ سیدانیاں اب تک خاموش تھیں۔ مگر جب انہوں نے اِس خونچکاں ڈرامہ کا ڈراپ سین دیکھا۔ تو ان کی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہو گئی۔ جو ایک خوفناک خواب دیکھتے دیکھتے بیدار ہو جائے۔ اور حقیقت کو خواب سے بھی زیادہ ہیبت انگیز پائے۔ زینبؑ نے پردہ سے جھانک کر دیکھا۔ تو ایک جگر خراش منظر سامنے تھا۔ عمرِ سعد کے حکم سے جسم مبارک گھوڑوں کے سُموں تلے روندا جا رہا تھا۔ اب ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا شہدا کی لاشوں پر مسلمان نہیں۔ . . . مردم خورندیو اور کریہہ منظر بھوت رقص کر رہے ہیں۔ بنتِ زہرہ کی آنکھیں اِس منظرِ خونیں کی تاب نہ لاسکیں۔ اِن کے ضبط کا دِل ٹوٹ گیا۔ بھڑکی مگر زخم خوردہ شیرنی کی طرح گرج کر بولیں۔ عمرِ سعد اگر فرزند رسول کو قتل کرنے اور اہلبیت رسولؐ کو خانماں برباد بنا دینے کے بعد بھی تمہاری پیاس فرو نہیں ہوئی۔ تو اپنے درندوں کو ہٹا دے کہ میں بھائی کی لاش کو گود میں لے لوں۔ اور تیرے گھوڑے لاش امام کے ساتھ اس تباہ حال سیدانی کو بھی کچل ڈالیں"۔

مگر عمرِ سعد اپنی وحشیانہ تفریح میں اس قدر منہمک تھا۔ کہ سیدۂ عالم کی بیٹی کی صدائے درد اُس کے کانوں میں نہ پہنچی۔ ورنہ کیا عجب تھا کہ وہ یہ پیشکش قبول کر کے بھی اپنی حیوانیت کا ایک اور ثبوت

دے ڈالنا۔

(۲)

امام شہید کے جسم مبارک کے ساتھ یہ حیوانی کھیل کھیلنے کے بعد وہ اور اس کے رفقاء خیمہ عصمت و طہارت کا پردہ چاک کر کے حرم حسینؑ میں داخل ہوئے۔ اُس پیغمبر آخر الزماں کے زنان خانہ میں جس نے دوسروں کی برہنہ بیٹیوں کو ملبوسات دیئے اور غیروں کی بہوؤں کو چادریں اُڑھائیں سیدۃ النسا کی غیور بیٹی مسلمانوں کے ہاتھوں مخدراتِ خانہ رسولؐ کی یہ بے حرمتی برداشت نہ کر سکی۔ بد سیرت شمر کو سامنے کھڑا دیکھ کر بولی "او ملعون! مجھ پر نظر ڈالنے سے پہلے تیری آنکھیں پھوٹ کیوں نہ گئیں۔ قدرت کاملہ نے تیری بصارت کیوں نہ چھین لی۔ او جفا کار دیکھ خوب اچھی طرح دیکھ۔ کہ تیری آنکھوں کو اس جرم کی سزا دینے والے اس دنیا میں نہیں۔ دیکھ کہ میں رسول زادی ہوں۔ اُس شاہ کونین کی نورنگاہ جس نے حاتم کی بیٹی کو اپنے ہاتھ سے ردا اُڑھائی تھی"۔

یہ ہنگامہ سن کر عابد بیمار نے آنکھ کھولی۔ فوراً اُٹھے۔ کہ یزید کے دوزخی کتوں کو اس گستاخی کا مزہ چکھا دیں۔ مگر فرطِ نقاہت سے جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے اور اپنی بے بسی پر ایک آہ سرد بھر کر بیہوش ہو گئے۔

اُس وقت عمرو سعد خیمہ میں پہنچ گیا۔ اور اُس نے حکم دیا۔ کہ فاطمہؑ کی بہو بیٹیوں کی ردائیں اُتار کر اور اُنہیں رسیوں سے جکڑ کر اونٹوں پر بٹھا دیا جائے۔ یہ نظارہ نہایت دردناک تھا۔ جب یزیدی شیطانوں کے ہاتھ ان مقدس خواتین کے مبارک سروں کی طرف بڑھے۔ اور انہیں بے نقاب و بے حجاب کر کے اونٹوں پر بٹھا دیا۔۔۔ اس حالت میں کہ ان کے چہرہ ہائے اقدس پر ہر نامحرم کی نظر پڑتی تھی۔ یزیدی درندے دیکھتے تھے۔ اور ہنستے تھے۔ مسلمان۔۔۔ آہ رسولِ کریمؐ کا کلمہ پڑھنے والا مسلمان اپنے ہادی و پیغمبر کو خراجِ عقیدت ادا کر رہا تھا۔ کتنا خوفناک خراج تھا یہ؟ کہ جس نواسی کو رسول صلعم نے اپنے ہاتھ سے ردا اُڑھائی اُسی کا ناموس آج اُس کے نانا کے پیرؤں کے ہاتھوں لٹ رہا تھا۔ اُف اُف۔ اگر حیرت ہے تو یہ کہ آفتاب اس منظر کو دیکھ کر زمین میں کیوں دھنس نہ گیا۔ قہرِ الٰہی نے فرزندانِ گیتی کو کیوں نہ پھونک ڈالا۔

(۳)

کاروانِ بیکساں ایک پڑاؤ پر جا کر ٹھہر گیا تھا۔ چاندنی رات تھی مگر درد و فغاں نے چاروں طرف پھیل کر اسے اس قدر تاریک بنا دیا تھا۔ کہ چاند کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ صحرا کی ریت کے ذرے اس طرح چمکتے تھے۔ جیسے چشمِ غزالیں میں موٹے موٹے آنسو۔ ریگستان کی فضا بھی

کبھی عابدِ بیمار کے نعرہ "یا حسینؑ" سے گونج اُٹھتی تھیں۔ وہ اپنے شہید بابا کو یاد کرتے۔ تو کلیجہ میں ایک ہوک سی اُٹھتی۔ دِل کا دُھواں دماغ تک پہنچتا۔ اور ہر دوسرے لمحہ بیہوش ہو جاتے۔ ہر چند کہ غمزدہ پھوپھی نے کلیجہ سے لگا رکھا تھا۔ لیکن انہیں کسی پہلو قرار نہ تھا۔ علیؑ کے بیمار پوتے کی صدائے غمناک نے شجر و حجر کے کلیجے مسل ڈالے۔ مگر عمرو سعد، شمر اور خولی برابر ہنستے اور قہقہے لگاتے رہے۔ اُن کے لئے یہ شب برات تھی نہ کہ شبِ ماتم ٭

صُبح ہوئی تو عورتوں اور عابدِ شب زندہ دار نے نمازِ فجر ادا کی۔ وضو کے لئے پانی کئی دن سے میسّر نہ آیا تھا۔ اتنے دن تیمم کر کے خالقِ موجودات کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تھے۔ لیکن اب ہاتھ بھی بیکار تھے۔ رسّیوں نے انہیں اتنی مضبوطی سے باندھ رکھا تھا۔ کہ تیمّم کرنا بھی ناممکن تھا۔ صُبح ماتم کے نمودار ہوتے ہی بی بی زینبؑ نے نماز سے فارغ ہو کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیئے۔ اور فرمایا۔ خداوندا! میں جانتی ہوں کہ ہم اسیرانِ بلا کی یہ نماز قضا کے برابر ہے۔ مگر کیا کریں تیری رضا یہی ہے۔ کہ ہمیں وضو کے لئے پانی تو کجا تیمّم کا موقعہ بھی نصیب نہ ہو۔ اگر یہ خطا ہے تو معاف کر دینا۔ اور اگر یہ مجبوری ہے۔ تو اپنے بندوں پر کرم کرنا ٭

مجبور و رسن بستہ زینبؑ کے الفاظ جب عمرو سعد کے کان میں پہنچے۔ تو وہ گھبرا کر بولا " اگر رسیوں کی گرفت سخت ہے۔ تو مجھ سے کہتی۔ میں پھندہ ڈھیلا کر دیتا۔ نماز کا یہ عذر قطعاً غلط ہے"۔

بی بی زینبؑ نے نگاہ آسمان سے ہٹائے بغیر فرمایا " میں جس سے عذر کر رہی ہوں۔ وہ بہتر جانتا ہے۔ کہ میرا عذر صحیح ہے یا غلط۔ عمرِ سعد کیا وہ نہیں دیکھتا۔ کہ رسیاں ہمارے جسموں میں کھب گئی ہیں۔ اور ہم میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ ہاتھ تک ہلا سکیں۔ خدا گواہ ہے۔ کہ میں نے خاندانِ رسولؐ کی واحد نشانی اور خاتونِ جناں کے پوتے کا بخار اپنی پیشانی کو اُس کی گردن پر رکھ کر دیکھا ہے۔ ظالم جس نے فرزندِ رسولؐ کی جان لی ہے۔ جس نے رسولؐ زادیوں کو بے حُرمت کیا۔ جس نے رسول اللہ کے بیمار نواسے کو پابہ زنجیر کیا۔ اُس سے رحم کی کیا توقع ہو سکتی ہے اور اُس سے پھندہ ڈھیلا کرنے کی درخواست میں کیوں کرتی"۔

عمرو سعد سے بنت فاطمہؑ کی ان کھری باتوں کا کوئی جواب بن نہ آیا۔ لیکن امام عابدؑ نے فرمایا " عمرِ سعد اگر تو اب بھی اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہے۔ کہ اپنے کشتگانِ ستم پر رحم۔ تو لا۔ میرے باپ کا سر میری جھولی میں ڈال دے۔ میں اسے سینہ سے چمٹا کر دل کا

غبار نکال لونگا"۔

بد طینت خولی بول اُٹھا۔ تو لبِ مرگ ہے۔ مگر ابھی تک دماغ سے بوئے بغاوت نہیں گئی۔ ارے حسینؑ باغی تھا۔ اُس کا سر صرف اِس شرط پر مِل سکتا ہے۔ کہ تو اُسے پاؤں سے ٹھوکر مارے"۔

بیمار نے ایک آہ کی۔ وہ آہ جو ایک بھبھوکا تھی۔ اور شیاطین یزید کو جلانے کے لئے کافی۔ مظلوم جب ظلم کا انتقام نہ لے سکے۔ تو اس کے سینہ سے آہیں ہی نکلتی ہیں۔ لیکن مسلم کی شہزادی نے خولی کو جھڑکا اور کہا چپ رہ او زبان دراز۔ یہ سر جس کی شان میں تو گستاخیاں کر رہا ہے۔ اب بھی دو جہاں کا مالک ہے"۔

(۴)

قافلہ مظہر تھا ماتم شہداء کا۔ کسی دولہا کی برات نہ تھی لیکن جب سیّدہ عالم کی بہو اور بیٹی برہنہ سر دامن بستہ کوفہ میں داخل ہوئیں۔ تو انہوں نے دیکھا کہ شہر کو دولہن کی طرح آراستہ کیا گیا ہے قلعہ کی آرائش کا اہتمام اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ مسلّح سپاہیوں نے مظلوم و بے نقاب بیبیوں کو اونٹوں سے اُتارا۔ اور ابن زیاد کے سامنے لے چلے۔ دربار میں پہنچے تو سطوتِ شاہی کا مظاہرہ قدم قدم پر ہوتا تھا۔ گویا ابن زیاد نے اِس امر کا اہتمام کیا۔ کہ

ہر شے پر نظر پڑتے ہی اہلبیت علیہم السلام کو اپنی بیکسی اور ابن زیاد کی شوکت و دولت کا احساس ہوا۔ اُس نے بت اپنوں کے دربار میں پہنچتے ہی جو کچھ کہا۔ اُس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا۔ کہ اِس آرائش و زیبائش کا مقصد زخم خوردگان کربلا کے دلوں پر چرکے لگانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ بی بی زینبؑ کو دیکھ کر ہنسا اور بولا "باغی بھائی کی سرکش بہن۔ تُو نے حسینؑ کا انجام دیکھ لیا۔ خدائے ذُوالجلال نے اُسے اس کے اعمال کی سزا دے دی"۔

بی بی زینبؑ کا دل یہ سُن کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ لیکن یہ وقت رونے اور چلّانے کا نہ تھا۔ علیؑ کی بیٹی کو اگرچہ اپنی بے پردگی کا سخت قلق تھا۔ تاہم اُس نے مغرور اور کمینہ دشمن کے سامنے جُھکنا نہ سیکھا تھا۔ زینبؑ نے فخر سے سر اونچا کر کے کہا "حسینؑ خدا اور اُس کے رسولؐ کا حُکم بجا لایا۔ اُس نے جان دے دی۔ مگر تجھ جیسے مومن نما کافر کے ہاتھ میں ہاتھ دینا قبول نہ کیا۔ یہ ہے بنو فاطمہؑ کی شانِ امتیازی"۔

ابن زیاد کھسیانا سا ہو گیا۔ اور اپنی خفت مٹانے کے لئے حسینؑ کے سر کو چھڑی سے چھیڑنے لگا۔ زید بن ارقم صحابی رسول اللہ یہ دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے۔ اور بولے "یہ بے ادبی؟ عبید میں نے اِن رُخساروں پر رسولِ خداؐ کو بوسے دیتے دیکھا ہے"۔

ابن زیاد کی آنکھیں خُون کبوتر ہوگئیں۔ غضبناک ہوکر بولا "اگر کوئی اور شخص ایسا کہتا۔ تو اِس کی زبان گدی سے کھچوا لیتا۔ مگر آپ صحابۂ رسولؐ ہیں۔ اِس لئے درگزُر کرتا ہُوں"۔

زید کی غیرت جوش میں آئی۔ کہنے لگے۔ اگر میرے قتل کا ارمان دِل میں ہے۔ تو وہ بھی نکال لے۔ تُو اپنے دربار میں رسول زادیوں کو بے پردہ کیا۔ اُس دِن کا انتظار کر جسے یوم الحق کہا جاتا ہے۔ اُسی دن تیرے ناموس کی بربادی شروع ہوگی۔ آج تیری بہن بُرقعہ میں ہے۔ اور فاطمہؑ کی بہو بیٹیاں کھُلے مُنہ نامحرموں کے سامنے کھڑی ہیں۔ لیکن وہ وقت دُور نہیں جب تیرا کیا تیرے آگے آئیگا"۔

ابن زیاد چُپ ہو رہا۔ کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ چند گھنٹے بعد قافلہ نے شام کی طرف مراجعت کی۔

(۵)

جُوں ہی عمرو سعد اسیرانِ کربلا کو ساتھ لئے موصل پہنچا۔ شہر کے دروازے بند کر دئے گئے۔ اُس کے تعجب و غضب کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے اہلِ موصل کو پکار کر باآوازِ بلند کہا "تم جانتے ہو۔ کہ خلیفۃ المسلمین سے بغاوت کرنے کی سزا کیا ہے۔ دروازے کھولو۔ ورنہ یزید کا قہر تمہیں تباہ کر دیگا۔ تمہارے مکان جلا دئے جائیں گے۔ تمہاری عورتیں حرم

حسینؑ کی طرح اسیر ہو جائیں گی۔ اور تمہارے بچے مصر و یونان میں جا کر فروخت ہونگے۔ حسینؑ کا سر دیکھو۔ عبرت حاصل کرو۔ اس کی مثال سے اور اپنی وفاداری کا ثبوت دو"۔

مگر موصل ٹس سے مس نہ ہوا۔ اہل شہر کے بڑے بوڑھوں نے کہا "عمرِ سعد یہ موصل ہے کوفہ نہیں۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ یاد رکھو۔ کہ ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا"۔

عمرِ سعد اپنی دھمکی کارگر نہ ہوتے دیکھ کر پڑاؤ ڈالے بغیر چل پڑا۔

آخر مظلوموں کا قافلہ دمشق پہنچا۔ جب غریب الوطن سیدانیاں دربار شام میں حاضر کی گئیں۔ اُس وقت بی بی زینبؑ نے فرمایا۔ یزید! تو نے جو کچھ کیا۔ اُس کا بدلہ تجھ سے خدا لے گا۔ ظالم۔ ظلم کی کوئی حد ہوتی ہے جس رسولؐ کا کلمہ تو پڑھتا ہے۔ اُس کی بچیاں تیرے دربار میں بے نقاب کھڑی ہیں۔ ڈر اُس قہار و جبار سے جس کے انتقام سے کوئی نہیں بچ سکتا"۔

یزید ہنسا اور بولا۔ انتقام! کیا اپنے دشمن کو تختِ خلافت کے باغی کو۔ شہنشاہیتِ اسلام کے منکر کو سزا دینا گناہ ہے۔ حسینؑ نے حکمِ خدا کے خلاف بغاوت کی اور اُس کی سزا پائی۔ میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے"۔

یہ کہہ کر اُس نے حکم دیا۔ کہ بیدانیاں۔ عابد بیمار اور بچے وغیرہ سب زنداں خانے بھیج دئے جائیں ✧

(۶)

رات کا وقت تھا۔ تمام دُنیا محوِ خواب تھی۔ مگر یزید محل شاہی میں کروٹیں بدلنے میں مصروف تھا۔ سونے کی کوشش کرتا۔ مگر کیا مجال کہ آنکھ جھپکے۔ وہ اُٹھا اور ساغر بلوری میں شراب اُنڈھیل کر پینے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے شراب انسانی لہو بن کر رہ گئی ہو۔ وہ سوچنے لگا۔ خون۔ اُف! میں خاندانِ رسالت کے مہپاروں کا خون پی رہا ہوں۔" اور ساغر ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا پڑا ✧

اُسی وقت ایک چیخ کی آواز سے فضا میں تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی۔ آواز جانب زنداں سے آئی تھی۔ یزید دیوانوں کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور مجلسِ اہلبیت علیہم السلام کی طرف چلا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا۔ کہ ایک تنگ و تیرہ کوٹھڑی میں بی بی زینبؑ ماں جائے بھائی کا سر گود میں لئے بین کر رہی ہیں۔ یزید نے آہنی سلاخوں کو زور سے تھام لیا۔ اور بولا "زینبؑ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب یہ سر مجھے دیدے۔ کہ تیرا سوگ ختم ہو اور تجھے صبر آجائے ✧

زینبؑ سرِ حسینؑ کو سینہ سے لپٹا کر بولیں "ہاں۔ تو کہتا ہے۔ کہ جو

ہونا تھا ہو چکا۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر تو اندھا ہے۔ ہمارے مصائب ختم ہوئے اب ہم بیکسوں کی آہیں تیرے لئے ایک دوزخ تیار کر رہی ہیں۔ جس میں تو تا قیامت جلتا رہے گا"۔

اُسی دن سے یزید ایک باطنی آگ میں جلنے لگا۔ یہ آہ مظلوماں کا اثر ہو۔ یا کچھ اور لیکن کہتے ہیں۔ کہ کئی برس بعد جب اُس کی لاش قبر سے نکالی گئی۔ تو اُس کی ہڈیاں بھی جل کر سیاہ ہو چکی تھیں۔

---

# کاروانِ غم مدینہ منوّرہ میں

کتنا درد انگیز و رقّت خیز تھا۔ وہ جگر گداز منظر جب اہلبیت علیہم السلام کا لُٹا ہُوا قافلہ مدینہ منوّرہ کی حدود میں پہنچا۔ عابد بیمار کی رُوح کانپ اُٹھی۔ اِن کی چیخیں نکل گئیں۔ بیکسوں کا سفینۂ غم کنارے آلگا تھا۔ لیکن اِس حالت میں کہ ناخدا اور تمام شجاع و جانباز مسافر طوفان ستم کی نذر ہو چکے تھے۔ اور پھٹے ہوئے بادبان ٹوٹے ہوئے چپّو۔ اور بچے کھچے مسافروں کے ہراس زدہ و غم زدہ صبر یہ بتا رہے تھے۔ کہ سمندر میں کشتی پر کیا گزُری ہے۔ حسینی کارواں کی حرماں نصیب عورتیں سوچنے لگیں۔ جہاں ہماری خاندانی وجاہت کی دھاک تھی۔ وہاں اس بیکسانہ حالت میں داخل ہونگے یا خدا تُو نے کیا کیا؟

دُور سے جب سبز گنبد دکھائی دیا۔ تو حسرت نصیب زینبؑ نے خواتین عصمت و طہارت کو آواز دی۔ کہ اب عماریوں سے اُتر پڑو۔ وہ نانا رسولِ خدا کا روضہ سامنے نظر آرہا ہے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ وہیں خیمے نصب ہوگئے۔ جب آلِ رسول کی تباہی و بربادی اور لٹے ہوئے قافلہ کی واپسی کی وحشت ناک خبر شہر میں پہنچی۔ تو گریہ وزاری سے در و دیوار لرز اُٹھے۔ گھروں کے دروازے کھُلے اور ہر دو زن بیرونِ شہر کی جانب روانہ ہوئے۔ جہاں رسولِ خدا کے اہل حرم کی بیکسی کلمہ گویان حق کے بیدادستم کی فریاد کر رہی تھی۔ عزادار جوق در جوق خیام اہلبیت کے متصل جمع ہو رہے تھے۔ کوئی سر پیٹتا تھا۔ اور کوئی اپنا گریبان چاک کرنے میں مصروف تھا۔ زنانِ مدینہ الگ بال نوچ رہی تھیں۔ بنت علیؑ فرما رہی تھیں۔ حسینؑ بھیا مدینہ کے لوگ تمہارا استقبال کرنے آئے ہیں۔ دیکھو زہرہؑ کے لال ان کی آنکھیں تمہارے انتظار میں پتھرائی جاتی ہیں۔ تم کہاں ہو شیر علی! لوگ پوچھتے ہیں۔ زینبؑ! حسینؑ کیوں نہیں آئے۔ اِن کو کہاں چھوڑ آئی ہو۔ اچھا بھیا۔ بولو۔ انہیں کیا جواب دوں۔ کیا یہ کہدوں۔ کہ میں اپنا گھر کربلا میں لُٹا آئی ہوں میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ماں جائے کو زمین کو سونپ دیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے فرزند رسولؐ کو شہید ہوتے دیکھا۔ اور خود بڑے

آرام سے بڑے اطمینان سے بڑے چین سے گھر لوٹ آئی۔ مری نہیں۔ وہیں شہید نہ ہو گئی۔ زندان شام کی دیواروں سے سر ٹکرا کر چکنا چور نہ کر لیا۔ لیکن بھیا۔ کیسے کہوں۔ لوگ میری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ وہ کہیں گے۔ زینبؑ تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم اپنے حسینؑ کو نعتِ رسولؐ کی طرح پیار کرتی تھیں۔ تم نے اپنی زندگی حسینؑ کے لئے وقف کر دی تھی۔ حسینؑ ہی تمہاری دُنیا تھی۔ پھر یہ کیسے سچ ہو سکتا ہے۔ تم رسولؐ کی نواسی ہو۔ علیؑ اور فاطمہؑ جیسے صداقت شعار والدین کی بیٹی۔ جھوٹ نہ بولو۔ سچ سچ بتا دو حسینؑ کہاں ہیں؟

حضرت زینبؑ دیوانوں کی طرح گریہ کرنے لگیں۔ اور دیگر خواتین کے ساتھ عزاداروں کے حلقہ میں شہر کی طرف چلیں۔ درِ مدینہ پر پہنچ کر انہوں نے شہر کو نگاہِ حسرت سے دیکھا۔ اور کہا۔ اے میرے نانا کے شہر جب میں تجھ سے رخصت ہوئی تھی۔ اس وقت میں ایک شہزادی تھی۔ آج ایک بیکس بھکارن ہوں......وہ بھکارن جسے اس ملعون یزید نے بن مانگے آزادی کی بھیک بھی دی ہے۔ یہ بیبیاں کبھی سرتاج والی تھیں۔ آج ان کے سر برہنہ ہیں۔ ان کے سرتاج ان کی عزّت کے محافظ میدانِ کربلا میں شہید ہو گئے۔ ہماری جمعیّتِ خاطر منتشر ہو گئی۔ ہم تباہ ہو گئے۔

شہر میں داخل ہونے پر آہ و بکا کی صدائیں بلند ہوتی گئیں۔ لوگ روتے تھے۔ بلک بلک کر سسکیاں بھر بھر کر اور خواہر حسینؑ فرما رہی تھیں "کہاں ہیں ہاشمی جوان وہ ہماری مدد کے لئے کیوں نہیں آتے۔ کیا ان کو معلوم نہیں۔ کہ ہم نے کیا کیا ستم اُٹھائے۔ اور ہم پر کیسے کیسے ظُلم ہوئے۔ ہمارے مرد ذبح کر دئے گئے۔ ہمارا مال لُوٹ لیا گیا۔ اور ہماری ردائیں اُتار لی گئیں ہمارے زار و نزار بچّوں کے رُخساروں پر طمانچے مارے گئے۔ اے مدینہ والو! اس بیکس پر آہ و بکا کرو۔ جس پر آب فرات بند کر دیا گیا۔ جس کا خون تپتی ہوئی ریت پر بہا دیا گیا۔ جس کو آبِ شمشیر نے غُسل دیا اور خاکِ صحرا نے محفوظ کیا"۔

مدینہ تڑپ اُٹھا۔ بیقرار ہو اُٹھا۔ یہ فریاد تو فرشتوں کو بھی رُلائے دیتی تھی۔ مدینہ والے تو پھر بھی انسان تھے۔ ان کے نالوں سے سرزمین مدینہ میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔

اتنی دیر میں غریب الوطن مظلوموں کا قافلہ عزاداروں کے اژدہام کے ساتھ روضہ رسولؐ پر پہنچا۔ فرطِ غم اور وفورِ نقاہت سے حضرت زینبؑ کھڑی نہ رہ سکیں۔ بیہوش ہو کر گرنا ہی چاہتی تھیں۔ کہ درِ مسجد کے کواڑ کو تھام لیا۔ اور وہیں بیٹھ گئیں۔ اور نہایت رقّت انگیز لہجہ میں پکار کر کہا۔ نانا میں آپ کے فرزند کی سنانی لے کر آئی ہوں۔

یہ کہہ کر دیوانہ وار قبر مطہر سے لپٹ گئیں۔ اور جگر پارہ نبیؐ کی خُون آلودہ اور تار تار قبا قبر پر رکھ کر بولیں "یہ سوغات ہے۔ نانا۔ یہ حسینؑ کی سوغات ہے جو بھیّا نے آپ کے لئے بھیجی ہے"۔

قبر مطہر ہلنے لگی۔ بنت علیؑ رو رہی تھیں۔ اور کہہ رہی تھیں۔ میرے نانا اور خدا کے رسولؐ آپ کی اُمّت نے آپ کا کلمہ پڑھنے والوں نے آپ کے احسان کا بدلہ یہ دیا ہے۔ ہمارے سینے فگار ہیں اور دِل داغدار۔ یہ داغ نہیں مٹیں گے۔ کبھی نہیں"۔

---

# ہدایتُ الزائرین

چونکہ زائرین عدم واقفیّت کے باعث بعض ضروری مقامات کی زیارت سے بہرہ ور ہونے سے معذور اور ثواب عظیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ اِس کمی کو پُورا کرنے کی خاطر یہ رسالہ تیار کیا گیا ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ اس کے ہوتے ہوئے زائرین کو تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ راستہ میں ان کے لئے گائیڈ کا کام دیگا۔ قیمت ایک روپیہ ...... عہ

# قسمت کا پھندا

(۱)

ابن زیاد حاکم کوفہ کے دربار میں رسول صلعم کی بہو بیٹیاں چاک گریباں و سر برہنہ کھڑی تھیں۔ سینوں سے آہوں کا دھواں اور زبان سے فغاں کے شعلے نکل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ خواتین عصمت و طہارت کا سوز بیوگی۔ کوکھ جلی ماؤں کا زخم جگر اور حرماں نصیب بہنوں کا شرارِ غم ایک آگ کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ اور اس آگ میں ابن زیاد بد نہاد کی شاہی وجاہت اور حاکمانہ تمکنت سب جل کر راکھ ہو جائے گی۔ بیوگان دیتا مے کے مُنہ سے ہر لمحہ وا حسینا وا حسینا کے جگردوز نعرے بلند ہوتے تھے۔ اور دربار کے احاطہ کے

باہر آنے لگے۔ مومنین کے دل و جگر کو چیرتے چلے جاتے تھے دربار میں ایک ہنگامہ بپا تھا۔ نغمہ شادی کا نہیں نوحہ غم کا۔

اور ابن زیاد ایک پابستہ زنجیر قیدی سے جو ہتھکڑیوں سے اپنا سر پھوڑنے کی سعی ناکام میں مصروف تھا۔ کہہ رہا تھا۔ مختار! دیکھو۔ جی بھر کے دیکھو۔ یہ اُس حسینؑ کا سر ہے جس کے لئے تم نے یزید کی بادشاہت کے خلاف عَلم بغاوت بلند کیا تھا۔ یہ اس باغی کے انصار و احباب کے سر ہیں۔ جس کے ایک نائب کو بچانے کے لئے تم کوفہ کی گلیوں کو رزمگاہ میں بدل دینے کے متمنی تھے۔ تم نے حالت کفر میں خاندانِ یزید کی مستورات کو بیوہ اور ان کے بچوں کو یتیم کر دیا تھا۔ دیکھو آج خانۂ بو تراب کی عورتیں بچے سوز بیوگی و آتش یتیمی میں جل رہے ہیں۔ ہتھکڑیوں سے اپنا سر پھوڑنا چاہتے ہو؟ نہیں میں تمہیں اتنی آسان موت مرنے دونگا۔ دیکھو۔ خوب جی بھر کر دیکھو۔ اپنے آقا و مولا کے سر کو اتنا دیکھو۔ کہ تمہارا دل چھلنی چھلنی ہو جائے۔ تمہارے سینہ کے ناسور بہنے لگیں اور تمہارا جگر خون ہو جائے۔ میں تمہیں قتل نہیں کرونگا۔ زندہ رکھوں گا اس لئے کہ تم اس آگ میں جلتے رہو... ہمیشہ... ہمیشہ!"

مختار نے کہا۔ ابنِ زیاد۔ آج تمہارا حکم قانون ہے۔ تم آل محمدؐ کو جتنا چاہو ستا لو۔ ہائے مجھے بدنصیب کے مقدر میں یہ منظر دیکھنا بھی

لکھا تھا۔ کہ بناتِ حیدر کرار میرے دوش بدوش کھڑی ہوں! وران کی زبان پر آہ و بکا ہو لیکن یاد رکھ۔ پاپ کا بیڑا بھر کر ڈوبتا ہے۔ میں رسولؐ اور ان کے فرزند شہید کی محبت کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ اگر قید سے جیتا نکل آیا تو ایک ایک سے امام مظلومؑ کے خون کا بدلہ لونگا"۔

ابن زیاد ہنسا اور کہا "تمہیں اس بوسیدہ روایت پر بھروسہ ہے مگر جس روز رسولِ مقبول جنگ تبوک کو گئے۔ اس روز تمہارے علاوہ اور بھی سینکڑوں بچّے قبائل عرب میں پیدا ہوئے تھے"۔

مُختار کی آنکھیں فرطِ غضب سے سُرخ ہوگئیں۔ اس نے کہا۔ "او بیوقوف! لیکن رسول اللہ نے ہر بچّہ کے متعلّق یہ نہیں فرمایا۔ کہ وہ قاتلان حسینؑ کو تلوار کے گھاٹ اُتار دے گا"۔

تھوڑی دیر کے بعد دربار میں سنّاٹا چھا گیا۔ امرائے دربار کے دل میں یہ سوال اُٹھنے لگا۔ کہ اگر رسول مقبول کے متعلّق علی کی یہ حدیث سچ ثابت ہو۔ تو...؟ ابن زیاد فوراً بھانپ گیا۔ کہ سرداروں کے دماغ میں کیا خیالات چکّر لگا رہے تھے۔ اس نے کہا بوتراب کی یہ حدیث ان ماتم زدہ عورتوں کو سُناؤ۔ تاکہ ان کی تسلّی ہو۔ لیکن سمجھ لو۔ کہ زندان سے تمہاری لاش ہی نکلے گی"۔

مختار نے حقارت سے مُنہ پھیر لیا۔ وہ اس بد باطن کی صورت بھی

نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ جو رسولِ کریمؐ کے قول سے منکر ہو۔ ابنِ زیاد کے سپاہی اسے جیل خانہ میں لے گئے ٭

(۲)

مختار نے سچ کہا تھا۔ کہ پاپ کا بیڑا بھر کر ڈوبتا ہے۔ شاید یزید اور اس کے حواریوں کے گناہوں کا پیمانہ لبریز ہونے میں ہنوز کچھ کسر تھی۔ کوفہ میں تشدد کا چکر چلنے لگا۔ علیؑ کا نام لینا جرم قرار دیا گیا۔ خود حاکم شہر نے دربارِ عام اعلان کیا۔ کیا اگر کوئی شخص قتلِ حسینؑ پر آنسو بہاتا پایا گیا۔ تو اسے گرفتار کر لیا جائیگا۔ اور یزیدی حکومت اس کا مال ضبط کر لے گی۔ کوفہ غداروں کا شہر تھا۔ اس نے ان احکام پر خوشیاں منائیں جشن کئے گئے۔ اور شب کو چراغاں ہوا۔ جو نہ چار محبِّ اہلبیتؑ شہر میں موجود تھے۔ ان کے خوف نہ ہراس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اگر روتے بھی تو چھپ کر کہ کوئی دیکھ نہ لے ٭

دن گزرتے گئے۔ لیکن جبر و اکراہ میں کمی واقع نہ ہوئی۔ حاکم کے آدمی شبانہ روز کوفہ کی گلیوں میں اس کے جابرانہ احکام کا اعلان کرتے تھے۔ جس پر محبتِ حسینؑ کا شبہ ہوتا۔ اسے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا جاتا گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ جبر کی حکومت میں ایسا ہوا کرتی ہے۔ کوفہ میں ایک معلم تھا۔ کثیر بن عامر۔ اس کے بزرگ ہمدان کے رہنے والے

تھے۔ گردشِ روزگار انہیں کوفے لے آئی۔ یہاں اعلےٰ خاندان کے بچّوں کی تعلیم و تربیت ان کے سپرد ہوئی۔ آدمی لائق تھے۔ دنوں میں ہی عزّت و رسوخ کے مالک ہو گئے۔ کثیر کو بھی بنظرِ احترام دیکھا جاتا تھا۔ وہ عالم باعمل تھا۔ اور امام حسینؑ کے خونِ معصوم نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ صُبح و شام جبر یزید پر لعنت بھیجتا۔ اور دل ہی دل میں شہادت حسینؑ پر کُڑھتا۔ لیکن کیا مجال کہ احساس باطن کو زبان پر لا سکے۔ ابن زیاد کی حکومت میں یہ ایک ایسا جُرم تھا جس کی کوئی معافی نہ تھی۔ ایک دن مکتب میں بچّوں کو پڑھا رہا تھا۔ کہ پیاس لگی۔ ایک طالب علم سے آبخورہ لے کر پانی پیا۔ یکایک اسے سیّد الشہداء کی پیاس یاد آگئی۔ بیتاب ہو کر بولا۔ ”لعنت ہے اُن پر جنہوں نے امام مظلوم کو پیاسا ذبح کر دیا“۔

بات معمولی تھی۔ لیکن شیطان کے گھر میں شیطان ہی پیدا ہوتے ہیں۔ سنان ابن انس کے بیٹے کو اُستاد کا یہ فقرہ ناگوار گزرا۔ مکتب سے چُھٹی پاتے ہی وہ ایک تنہا جگہ گیا۔ وہاں اس نے پتھر مار کر اپنا جسم لہولہان کر لیا۔ اور ناک میں کچھ ایسے انداز سے ایک لکڑی ٹھونس دی کہ خون بہنے لگا۔ باپ نے یہ حالت دیکھی۔ تو بہت بیتاب ہُوا اور بولا ”میری آنکھوں کے نُور بتا۔ تیرا یہ حال کس نے بنایا۔ میں اس کی نسل کا خاتمہ کر کے دم لونگا“۔

ابنِ شیطان نے سسکیاں بھرتے ہوئے ایک من گھڑت داستان باپ کو کہہ سُنائی۔ اوّل تو کثیر کے محبّ اہلبیت ہونے کی شکایت کی اور اس کے فقرے دہرائے۔ پھر کہا۔ کہ جب مَیں نے ان فقرات پر اعتراض کیا۔ تو کثیر نے مجھے پیٹا۔ اور قتل کرنا چاہا۔ اور اگر مَیں بھاگ کر جان نہ بچاتا۔ تو اب تک میرا قیمہ ہو چکا ہوتا۔

غضب آلود باپ شیطان مجسّم بیٹے کو ابن زیاد کے پاس لے گیا اور بولا "عبید" دیکھ۔ تیری مملکت میں اب بھی ایسے لوگ بستے ہیں جو قتلِ امام کا انتقام معصوم بچّوں سے لیتے ہیں"۔

ابن زیاد کی پیشانی پر بَل پڑ گئے۔ ساری کہانی سُن کر اس کے مُنہ سے کف جاری ہو گیا۔ اور وہ کہنے لگا۔ اِس عامر کے بچّے کی اتنی ہمّت؟ اسی وقت سپاہیوں کو بُلاؤ۔ کہ وہ اِس مردُود کو گرفتار کر کے میرے حضور میں پیش کریں"۔

کثیر پکڑا گیا۔ اس نے بہتیرا کہا۔ کہ مَیں بے گُناہ ہوں اور شہادت کے لئے اپنے دیگر شاگردوں کو بُلانا چاہا۔ لیکن جہاں اندھیر نگری اور چوپٹ راجہ ہو۔ وہاں انصاف گونگا اور بہرہ ہو جاتا ہے۔ ابن زیاد کے حُکم سے کثیر بن عامر کو جیل میں بند کر دیا گیا۔

(۳۱)

زنداں میں جب مختار نے کثیر کی داستانِ غم سُنی۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے فاضل قیدی کو گلے لگا کر کہا۔ "گھبراؤ نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ یزیدی حکومت کا انجام قریب ہے۔ کوفہ کے لوگ جب دیکھیں گے کہ ان کے بچّوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ تو وہ بہت جلد تمہیں چھڑالے جائیں گے"۔

چند منٹ کی مُلاقات میں ہی کثیر کو مختار سے محبت ہو گئی تھی ․ ․ ․ ․ وہی محبت جو ایک خدا ایک رسول اور ایک امام کو ماننے والوں میں ہو جاتی ہے۔ مختار تلوار کا دھنی تھا۔ کثیر علم کا خزینہ۔ دونوں کی طبائع بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ لیکن اہلبیت علیہم السلام کی محبّت نے انہیں ایک کر دیا۔

کثیر بن عامر نے پُوچھا "اور تُم"؟

مختار نے آبدیدہ ہو کر کہا "مجھے اپنی قید کا غم نہیں۔ لیکن یہ خیال سوہانِ رُوح ہو رہا ہے۔ کہ اگر مجھے رہائی نہ ملی۔ تو خونِ امام کا انتقام کون لے گا"۔

کثیر بولا "میرے رفیق! اگر میں آزاد ہو گیا۔ تو اپنی جان پر کھیل کر بھی تمہیں زنداں سے چھڑا لونگا"۔

"سچ ؟" مختار نے پوچھا۔
کثیر بولا "بالکل سچ۔ میں پنجتن پاک کے خون معصوم کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ زندگی و موت ہر حال میں تمہارا ساتھ دونگا"۔

وقت گذرنے لگا۔ کثیر ایک صلح جو تندرست آدمی تھا۔ اور طبعاً آرام پسند اسے قید و بند کی اذیتیں سہنے کی عادت نہ تھی۔ لیکن مختار کی صحبت نے اسے جفاکش بنا دیا۔ یہ احساس اس کے اطمینان کے لئے کافی ہے کہ اسے یہ سزا عشق آلِ رسولؐ کی وجہ سے ملی ہے۔ نہ کہ کسی حقیقی خطا کے باعث۔

ان دنوں سکولوں کا رواج نہ تھا۔ تعلیمی حصول زر کا ذریعہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم و تدریس پیشہ لوگ بہت کم تھے۔ رفتہ رفتہ کثیر بن عامر کی عدم موجودگی کا احساس زور پکڑنے لگا۔ خود ابن زیاد کے لڑکوں کے لئے کوئی قابل معلم نہ ملتا تھا۔ اور امرائے شہر حیران تھے۔ کہ اس مسئلہ کو کیونکر حل کریں۔ کثیر بن عامر کی رہائی کے لئے ایک خاموش ایجی ٹیشن شروع ہو گئی۔ کثیر کی ایک بھتیجی حاکم کوفہ کے بچوں کی دایہ تھی۔ اس نے یہ موقعہ غنیمت جانا بال بکھیر لئے اور کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اور یاس و غم کی تصویر بن کر حاکم کوفہ کے بچوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے حرم سرا میں پہنچی۔ ابن زیاد کی بیوی کے پوچھنے پر اس نے کہا "بیگم میں تباہ

ہو گئی۔ میرے بزرگ چچا کو آقا نے قید رکھا ہے۔ حالانکہ وہ بالکل بے قصور ہیں۔ اپنے جگر پاروں کو دیکھو جس دن سے وہ قید ہوئے ہیں۔ اُسی دن سے اُن کی تعلیم چھوٹ گئی ہے۔ نہ ادب نہ اخلاق۔ جب دیکھو آوارہ پھرتے ہیں۔ بیوی! میری حالت پر رحم کھاؤ۔ اپنے بچوں کے مستقبل پر غور کرو۔ اور میں تم سے اپنے چچا.... کوفہ کے معلّم کی رہائی کی بھیک مانگتی ہوں۔ اگر تم چاہو۔ تو میرا دامن گوہر مقصود سے بھر سکتی ہو"۔

تیر نشانہ پر لگا۔ ابن زیاد کی بیوی نے یہ وعدہ کیا۔ کہ وہ اپنے شوہر سے کثیر بن عامر کی رہائی کی سفارش کرے گی۔ زن مرید عبید اس کی بات ٹال نہ سکا۔ دوسرے ہی دن کثیر بن عامر کی رہائی کے احکام جاری ہو گئے۔

نئے آفتاب کی پہلی کرن فاضل قیدی کے لئے آزادی کا پیغام لائی۔ آہنی سلاخوں کے حجرہ سے باہر آنے سے پہلے وہ مختار کے پاس گیا۔ دونوں میں چپکے چپکے کچھ باتیں ہوئیں۔ آخر میں کثیر نے ذرا بلند آواز سے کہا "خدا گواہ ہے۔ کہ میں تمہارے حکم کی تعمیل میں اپنی جان بھی جوکھوں میں ڈال دونگا"۔

اسی وقت شاہی پہرہ دار جیل خانہ میں داخل ہوا۔ اور بولا "کثیر تم جا سکتے ہو۔ حاکم نے تم پر رحم کر کے تمہیں آزاد کر دیا ہے"۔

کثیر جیل سے باہر آیا۔ تو اس کا دماغ تفکّرات کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ اِس کی ذمّہ داریاں کتنی عظیم تھیں۔ کتنی گراں۔ کیا وہ ان سے عہدہ برا ہو سکے گا"؟

(۴)

اِسی دن شام کو ایک مزدور جس کے سر پر لذیذ کباب روٹیوں اور میوہ جات سے بھرا ہوا خوان تھا۔ اور ہاتھ میں ایک ہزار دیناروں کا توڑا۔ داروغہ جیل کے دروازے پر آ کر رُکا۔ دستک دینے پر ایک عورت باہر آئی۔ مزدور نے خوان اور تھیلی اس کے حوالے کی اور کہا "یہ چیزیں کثیر بن عامر نے بھیجی ہیں۔ ایام اسیری میں انہوں نے منّت مانی تھی۔ کہ رہائی کے بعد آپ کے شوہر کی کچھ خدمت کریں گے"؟

جیل افسر گرگ جہاندیدہ ہوتا ہے۔ داروغہ تاڑ گیا۔ کہ منت محض ایک حیلہ ہے۔ ورنہ درحقیقت ان تحائف کی تہ میں کثیر کی کوئی غرض پنہاں ہے۔ دوسرے دن بھی اسی قسم کے تحائف پہنچے تیسرے ان تحائف بردار کے ہمراہ کثیر بھی چلا آیا۔ داروغہ نے اس کی تواضع کی اور کہا "یا کثیر! میں تیرا عندیہ سمجھتا ہوں۔ بتا تو مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے"؟

رشوت کام کر گئی۔ جب کثیر بن عامر نے دیکھا۔ کہ داروغہ اس کی مُٹھی میں ہے۔ تو اس نے کہا "کہ تم جانتے ہو۔ کہ مختار ابن زیاد کے

ظُلم کا شکار ہو رہا ہے۔ اس کی رہائی ہم تُم پر فرض ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں۔ کہ اسے کاغذ اور قلم دوات پہنچا دی جائے اور جو خطوط وہ لکھے وہ مجھ تک پہنچ جائیں۔ باقی انتظام میں خود کر لونگا"۔

داروغہ جیل ابن زیاد کے خوف سے لرز اُٹھا۔ بات معمولی ہے لیکن اگر حاکم کو پتہ چل گیا؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد اُسے ایک تدبیر سُوجھی اس نے کہا "کثیر پرسوں تم بہت سا کھانا پکوا کر لے آنا۔ میں یہ مشہور کر دونگا۔ کہ تم نے اسیروں کو کھانا کھلانے کی منت مانی تھی۔ قلم دوات اور کاغذ روٹیوں میں چھپا کر مختار کو پہنچا دئے جائیں گے۔ اور کسی کو شُبہ تک نہ ہوگا"۔

بات پُختہ ہوگئی۔ داروغہ اور کثیر یہ سمجھتے تھے۔ کہ یہ راز ان کے سینوں میں محفوظ رہے گا۔ لیکن جب روٹیاں آئیں۔ تو ابن زیاد بھی بلائے بے درماں کی طرح ان کے سر پر پہنچ گیا۔ اور داروغہ سے بولا۔ "نمکحرام! تُو بھی ان باغیان سلطنت میں شامل ہو گیا"؟

ابن زیاد نے روٹیوں کی تلاشی لی۔ نہ معلوم اس کو کیا اطلاع دی گئی تھی۔ داروغہ مارے خوف کے بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ اور کثیر خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دُعائیں مانگ رہا تھا۔ کہ اے پروردگار ہماری عزت رکھنا۔ اگر یہ موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔ تو مختار کی

رہائی کی سبیل نہ رہے گی۔ لیکن مارنے والے سے بچانے والا زبردست ہے۔ ابن زیاد کی آنکھوں پر ایسی پٹی بندھی۔ کہ اسے قلم دوات نظر ہی نہ آئی۔ تلاشی ختم ہونے کے بعد داروغہ نے اس کی قبا کو بوسہ دے کر کہا "حضور کو کسی دشمن نے غلط اطلاع دی ہے۔ کثیر نے منت مانی تھی کہ رہا ہونے کے بعد میں اسیروں کو کھانا کھلاؤنگا۔ یہ وہی روٹیاں ہیں۔ اِس خوان میں سوائے اشیاء خوردنی کے اور کچھ نہیں"۔

ابن زیاد مطمئن ہو کر چلا گیا۔ لیکن دِل ہی دِل میں وہ خفیف بھی ہو رہا تھا۔

ایک ساعت گزرنے پر داروغہ اندر سے دو خطوط لایا۔ ایک اس کی بہن صفیہ کے نام تھا۔ دوسرا اُس کے شوہر عبداللہ بن عمر کے نام۔ کثیر بن عامر نے دونو خطوط اپنی آستین میں چھپا لئے۔ اور داروغہ کا شکریہ ادا کر کے اپنے گھر کی طرف چلا۔ اسی رات وہ غائب ہو گیا۔ ابن زیاد حیران تھا۔ کہ معلّم کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ تلاش بسیار پر بھی اس کا کوئی سُراغ نہ ملا۔



(۵)

اِدھر کوفہ اپنے فاضل معلّم کی اتفاقیہ گمشدگی پر اُنگشت بدنداں تھا۔ اُدھر مدینہ منوّرہ میں ایک سرتا پا گرد سے اٹا ہُوا مُسافر ایک عالیشان

مکان کے دروازہ پر دستک دے رہا تھا۔ صاحب خانہ نے باہر آ کر پوچھا "تم کہاں سے آئے ہو۔ مسافر!"

اجنبی بولا "کوفہ سے۔ کیا عبداللہ بن عمر آپ ہی ہیں"۔

"ہاں"۔ عبداللہ نے کہا۔

قاصد نے کہا۔ باقی باتیں گھر جا کر ہونگی۔ اور عبداللہ کے ساتھ مکان کے اندر چلا گیا۔ جب میزبان و مہمان بیٹھ گئے۔ تو ایلچی نے کہا۔ "میں کوفہ کا ایک معلّم ہوں۔ میرا نام کثیر بن عامر ہے۔ مختار کے خطوط لایا ہوں ایک آپ کے لئے ایک اُن کی بہن کے لئے"۔

عبداللہ "تو خطوط لے کر اندر چلا گیا۔ چند منٹ زنانِ خانہ میں خاموشی رہی۔ اس کے بعد رونے پیٹنے کی صدائیں آنے لگیں۔ مختار کی بہن کہہ رہی تھی "خدا غارت کرے ابن زیاد کو جس نے میرے نازوں کے پالے بھائی کو قید کر رکھا ہے۔ میں سر پیٹ لونگی۔ بال نوچ ڈالوں گی۔ اپنا خون کر لوں گی۔ جب تک وہ آزاد نہ ہو مجھے کھانا پینا حرام ہے"۔

اور اس کا شوہر کہہ رہا تھا "صفیہ! تم صبر کرو۔ یزید ہماری طاقت سے بے خبر نہیں۔ وہ امام حسینؑ کے بعد ایک نیا فتنہ جگانا نہیں چاہتا میں اُسے خط لکھتا ہوں۔ وہ مختار کی رہائی کا حکم دینے سے انکار نہیں کرے گا۔ لیکن بہن کی تسلّی نہ ہوتی تھی۔ اس نے بھائی کے فراق میں

اور اس کی بیٹیوں نے ماموں کے غم میں اپنے سر کے بال منڈوا لئے اور عبداللہ سے کہا "اپنے خط کے ساتھ ہمارے بال بھی ایک سیاہ تھیلی میں بند کر کے بھیج دینا۔ کہ اس بے رحم کا پتھر دل پگھل جائے"۔

عبداللہ نے خط لکھا۔ بیوی اور بچیوں کے بالوں سے بھری ہوئی تھیلی کثیر کے حوالے کی اور کہا "اے فاضل محترم۔ خط کے ساتھ یہ تھیلی بھی یزید پلید کی نذر کر دینا۔ اور کہنا کہ یہ مختار کی بہن کے غم کا زندہ ثبوت ہے"۔

غمزدہ صفیہ کی دعائیں لے کر کثیر بن عامر نے دمشق کا رخ کیا۔

(۶)

اٹھارہ دن .... ایک نہیں ، دو نہیں ... پورے اٹھارہ دن گزر گئے۔ کثیر ہمدانی ہر صبح نماز سے فارغ ہونے کے بعد در یزید پر جاتا لیکن پہریدار روک لیتے۔ انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے کثیر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ بے قرار و مضطرب رہنے لگا۔ ایک سبزی فروش نے جو یزید کے محل میں ترکاری پہنچاتا تھا۔ اس مرد مومن کو مغموم دیکھ کر پوچھا "اے اجنبی۔ تمہارے غم کا سبب کیا ہے۔ تم زاہد و پاکباز نظر آتے ہو۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم آل محمدؐ کے پیارے ہو۔ کیا تمہارے غم کا سبب شہادت حسینؑ ہے یا کچھ اور بھی؟"

یہ کہتے کہتے وہ سبزی فروش بے اختیار رو دیا۔ کثیر نے اسے ہمدرد پاکر اپنا راز اس سے کہدیا۔ سبزی فروش بولا "یہ کام تو چنداں مشکل نہیں۔ میں کل ہی تمہیں محل میں پہنچا دونگا۔ یزید کا ایک سیاہ پوش غلام محب اہلبیت ہے۔ اس سے ملنا۔ وہ تمہیں یزید کے سامنے پیش کردیگا"۔

خوشی کے مارے معلّم کوفہ کی باچھیں کھل گئیں۔ آخر وہ وقت آہی گیا۔ جس کے لیئے اس نے طویل مسافت کی کٹھن منزلیں طے کی تھیں۔ اگلی صبح نماز سے فراغت پاکر وہ سبزی فروش کے ساتھ محل میں داخل ہوا۔ یزید کے سیاہ پوش غلام کو ڈھونڈنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ لیکن وہ سخت متحیر ہوا۔ جب اس نے دیکھا۔ کہ وہ مرد نیک یا حسینؑ یا حسینؑ کہہ کر گریہ وزاری کر رہا تھا۔ کثیر کو آتے دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھا اور بولا "بھائی تم اٹھارہ دن تک کہاں رہے۔ اتنے دن تمہارے انتظار میں میری تو آنکھیں بھی تھک گئیں"۔

عبداللہ کا ایلچی سخت حیران ہوا۔ اور خوفزدہ بھی یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ اس شخص سے کسی نے کہہ دیا۔ کہ میں اٹھارہ روز سے یہاں ہوں۔ اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر اس شخص نے کہا "حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے اٹھارہ دن قبل میں نے امام حسینؑ کو کہ ان کے گلوئے مبارک سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ خواب میں دیکھا۔ مجھ سے

فرمانے لگے۔ کہ مختار کی رہائی کے لئے ایک ایلچی یہاں آرہا ہے۔ اسے یزید کے پاس لے آؤ۔ اور اس کی حاجت پوری کر دو۔ میں اُسی دن سے تمہارا منتظر تھا"۔

یہ سُن کر معلّم پر ایسی رقّت طاری ہوئی۔ کہ وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ جب آنسو تھمے۔ تو سیاہ پوش غلام اسے یزید کے پاس لے گیا۔ یزید نے خط پڑھا۔ اور معلّم سے پُوچھا "کیا یہ خط تم لائے ہو"۔ سیاہ پوش غلام بول اُٹھا "ہاں یہی لایا ہے۔ لیکن کیا جناب کو یاد ہے۔ کہ حضور نے میری حاجت روائی کا وعدہ کیا تھا۔ آج وہ قول پُورا کیجئے"۔

یزید بولا "میں تمہیں ایک لاکھ دینار دینے کو تیار ہوں۔ لیکن اس معاملہ میں مجھ سے اصرار نہ کرو"۔

مگر غلام اپنی بات پر بضد رہا۔ یزید نے کچھ دیر سوچا۔ شاید اُسے مستقبل کی بھیانک تصویر نظر آ رہی تھی۔ کون جانے۔ اس درخواست کو نامنظور کرنے سے قتلِ حسینؑ کے خلاف بے چینی کی دبی ہوئی آگ پھر سُلگ اُٹھے۔ اس نے قلم ہاتھ میں لیا۔ اور مُختار کی رہائی کا حکم نامہ لکھ دیا۔ یزید کا یہ فیصلہ ایک سیاسی مصلحت پر مبنی تھا۔ اور سمجھتا تھا۔ کہ اس نے اپنی دُور اندیشی سے سلطنت شام کا تختہ اُلٹنے سے بچا لیا ہے.... اور خدا ہنس رہا تھا۔ اس کی بیوقوفی پر وہ سب

کچھ جاننے کا بہانہ کرتا تھا۔ لیکن تقدیر کا پھندہ کتنا مضبوط ہے۔ یہ اسے معلوم نہ تھا۔ اگر وہ یہ جانتا۔ کہ مختار کی رہائی کا حکم دے کر وہ اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کر رہا ہے۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ تو؟ لیکن قسمت اپنے شکار پر ہمیشہ لاعلمی میں وار کرتی ہے۔ جب ابن زیاد نے یہ حکمنامہ پڑھا۔ تو سر پیٹ لیا اور کہا "بس اب میرا انجام نزدیک آ گیا"۔

اور وقت نے بتا دیا۔ کہ اس کے اندیشے غلط نہ تھے۔

---

# امیر مختار کا آتشِ انتقام

(۱)

ایک حاکم اپنے بہنوئی کو قتل کر دے۔ بہن کی مانگ اُجاڑ دے۔
ہمشیرہ کا سہاگ چھین لے۔ اس سے بڑی اذیت اور کیا ہو سکتی ہے۔
لیکن مسلمانوں نے یہ اذیت بھی برداشت کی۔ یہ دُکھ بھی گوارا کیا۔
کیوں؟ محض اس لئے کہ اسلام کی محبت رسول کا عشق اور اللہ تعالیٰ کا
حکم اس کا مقتضی تھا مسلمان اپنا سب کچھ دے سکتا ہے لیکن اگر اس
سے ایمان مانگو۔ تو وہ آگ بھبوکا ہو جائیگا۔ ایک زخمی شیر کی طرح
تڑپ اُٹھے گا۔ مرنے مارنے کی تیاری کرنے لگے گا۔ یہی راز ہے دُنیا
میں اسلام کی کامیابی کا اور یہی جواب ہے حیرت زدہ اغیار کے

اِس استفسار کا کہ دینِ محمدؐ کو دوسرے مذاہب سے زیادہ مقبولیت کیوں حاصل ہوئی؟

امیر مختار کا دورِ حکومت قتلِ حسینؑ کے پانچ سال بعد شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ اُس کا زمانہ اقتدار بہت مختصر تھا۔ لیکن اس خادمِ اہلبیتؑ نے اس قلیل سے عرصہ میں بھی وہ کارہائے نمایاں کئے۔ جن کا ذکر زبان پر آتے ہی آج شیعیانِ حیدرِ کرار پھڑک اُٹھتے ہیں۔ اور جوشِ ایمانی سے دلوں میں ایک طوفان سا پیدا ہوتا ہے۔ ہاں نمودار اسلام پر مر مٹنے کی۔ جہاد فی سبیل اللہ میں قربان ہو جانے کی۔ خونِ شہدائے کربلا کا انتقام لینے کی بیتاب خواہش تڑپ اُٹھتی ہے۔ امیر مختار کی حمیت یہ گوارا نہ کر سکی کہ اُس کی نیام میں تلوار اور اُس کے بازوؤں میں طاقت ہو اور قاتلانِ سبطِ رسول عظیم ترین گناہ کے مرتکب ہو کر بھی صحیح و سلامت سینہ گیتی کو پائمال کرتے رہیں۔ اُس نے چن چن کر اشقیا کو مارا۔ کسی سے رعایت نہ کی۔ اور اس قتلِ عام میں اُس کے اپنے اقارب بھی کشتہ تیغ ہوگئے۔ اِس آتشِ انتقام میں اُس کے اپنے خویش و اعزا بھی جل گئے۔ اِس طوفان میں اُس کے اپنے پرائے سب بہہ گئے۔

(۲)

عمرو بن سعد امیر مختار کا بہنوئی تھا۔ اُس کی بہن کا سرتاج لیکن

جب دوسروں کی بہنوں کے شوہر قتل ہو رہے ہوں۔ جب دوسروں کی بیویوں کے بھائی تلوار کے گھاٹ اُتارے جا رہے ہوں جب عبداللہ بن کامل جیسے نمک حلال اور وفادار حکومت درباری کے سالے کو بھی نہ بخشا گیا ہو۔ اُس صورت میں امیر کے اپنے بہنوئی کے بچنے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ اور عمرو تو سب سے زیادہ گنہگار تھا۔ کیا اُسی نے لشکر حسینؑ پر فرات کا پانی بند نہ کیا تھا؟ کیا اُسی نے شہید کربلا کے کیمپ میں تیر پھینک کر مدینہ کے غریب الوطنوں کو دعوت جنگ نہ دی تھی؟ کیا اسی نے حسینؑ مظلوم کو تیروں کی بارش میں فریضۂ نماز ادا کرنے پر مجبور نہ کیا تھا؟ کیا اسی نے تشنہ لب اصغرؑ کو ایک گھونٹ پانی پلانے کی بجائے ہدفِ خدنگ نہ بنایا تھا۔ کیا اسی کے حکم سے سبطِ رسول کی نعش مبارک گھوڑوں کے سُموں تلے روندی نہ گئی تھی؟ اور کیا اِسی کے حکم سے خیام اہلبیت جلائے نہ گئے تھے۔ سیدانیوں کو ذلیل و رُسوا نہ کیا گیا تھا۔ زین العابدینؑ کو زنجیروں کا طوق نہ پہنایا تھا؟ .... پھر امیرِ مختار اُسے کیسے چھوڑ دیتا۔ عمرو کو خوب معلوم تھا۔ کہ فرمانِ رسولؐ کے مطابق حسینؑ کو ایذا دینا ایک ایسا گُناہ ہے جس کے لئے کوئی معافی نہیں۔ کوئی کفارہ نہیں۔ کوئی شفاعت نہیں۔ وہ ایک صحابی رسول کا فرزند تھا۔ اور اُس نے

دیدہ و دانستہ امام برحق کے خون سے ہاتھ رنگے۔ اندریں حالات مختار اسلام سے غدّاری کرتا۔ احکام رسولؐ سے مُنہ نہ موڑتا رضائے الٰہی کے خلاف بغاوت کرتا۔ اگر وہ اِس ملعون کو محض اِس لئے چھوڑ دیتا۔ کہ وہ اُس کا بہنوئی ہے۔ اور اس وجہ سے اس کے نزدیک قابل بریت و احترام۔

مختار نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہیئے تھا۔ ایک خادم جس کا نام خیر تھا۔ عمرو سعد کو امیر کوفہ کے دربار میں لایا۔ امیر نے کہا۔ "میرے پاس اِس کو کیوں لائے ہو۔ مجھے تو اِس کا سر چاہیئے تھا"۔

عمرو حیران رہ گیا۔ اُس نے اپنے رفقاء کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اُسے خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ کہ مختار اُن کے ساتھ بھی یہی سلوک کرے گا۔ حسینؑ کا قاتل۔ جس نے علی اصغرؑ کو ایک گھونٹ پانی کی بھیک نہ دی۔ اپنی جاں بخشی کے لئے گڑگڑایا۔ رویا اور چلایا۔ لیکن مختار کے دربار میں اُس کے لئے کوئی معافی نہ تھی۔ خیر اسے باہر لے گیا۔ اور بولا "احمق۔ تُو نے بے سُود امان طلب کی۔ ہمارا امیر رسولؐ کے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ اگر زندگی اتنی ہی عزیز تھی۔ تو جان نثاران اہلبیت کی جان بخش دیتا"۔

یہ کہتے کہتے اُس نے تلوار کا وار کیا۔ اور ایک ہی لمحہ میں عمرو

لعین کا۔ اِس دوزخی کُتّے کا جس نے ہنس ہنس کر خدّام رسولؐ کو ذبح کیا تھا۔ سر تن سے علیحدہ ہو کر زمین پر گر پڑا ✣

(۳)

اپنے باپ کی قتل کی خبر سُن کر عمرو بن سعد کا بڑا فرزند ہاں آیا اور رونے لگا۔ خیر اُسے امیر کے پاس لے گیا۔ مختار نے دریافت کیا "او ابن ملعون! کیا تو اُس وقت بھی رو رہا تھا۔ جب تیرا باپ حسینؑ کا سر لے کر فاتحانہ شان سے کُوفہ میں داخل ہوا تھا؟"

اُس نے کہا "یا امیر۔ اُس وقت مَیں نہیں رو رہا تھا۔ روتا بھی کیونکر جبکہ حسینؑ سے میرا کوئی رشتہ خون کا نہ تھا" ✣

امیر نے اُسی وقت کافر باپ کے کافر بیٹے کو قتل کرا دیا۔ اور کہا "جو آنکھ حسینؑ کی شہادت پر پُرنم نہیں ہوتی۔ وہ اِس قابل ہے۔ کہ اُسے تلوار کی نوک سے نکال پھینکا جائے" ✣

اس کے بعد عمرو بن سعد کے چھوٹے بیٹے کی باری آئی۔ وہ صاحب ایمان تھا۔ اپنے باپ اور برادر اکبر کے سر دیکھ کر مطمئن ہوا۔ اور بولا۔ "یا امیر۔ مَیں نے اپنے پدر ناہنجار کو بہتیرا سمجھایا۔ کہ دُنیا کے لئے دین بگاڑنا اور ایمان بیچ کر دُنیا خریدنا مناسب نہیں۔ لیکن اُس نے ایک نہ سُنی۔ مجھے اُس کی موت کا ذرا بھی غم نہیں۔ اس نے جیسا کیا ویسا پایا"

(۴)

امیر مختار کو عمرو بن سعد کے خاندان سے ذاتی عناد نہ تھا۔ اُسے اگر بیر تھا۔ تو کفر سے۔ وہ محب رسولؐ و اہلبیت رسولؐ تھا۔ اُس نے چھوٹے لڑکے کو چھوڑ دیا اور کہا "جامیں نے تجھے چھوڑا۔ تیرا خون میرے دیک روا نہیں۔ کہ تو محب حسینؑ ہے۔ نہ کہ اپنے باپ کی طرح دشمنِ آل رسولؐ"۔

مختار نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اُس نے اپنے بہنوئی کو قتل کرا دیا۔ لیکن دشمن ایمان کے فرزند کو چھوڑ دیا۔ ایک سچے مسلمان کے لئے ایمان ہی سب سے بڑی کسوٹی ہے۔ اور حُبِ دینی ہی سب سے بڑی سفارش۔

اُس کے برعکس عمرو بن سعد کا جو انجام ہوا۔ خدا وہ کسی کو نصیب نہ کرے۔ مختار وحشی نہیں تھا۔ جابر نہیں تھا۔ بربریت پسند بھی نہیں تھا۔ لیکن انتقام حسینؑ کی آگ اس کے دل میں کچھ اِس طرح بھڑک رہی تھی۔ کہ عمرو لعین کو کفن دفن بھی نصیب نہ ہوا۔ اس کا ناپاک جسم ایک ناکارہ شئے کی طرح۔ کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیا گیا اور جلد ہی اُس میں کیڑے پڑ گئے۔ لوگ اُسے دیکھتے تھے۔ اُس پر تھوکتے تھے۔ لعنت بھیجتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ اچھا ہوا۔ یہ مردود اسی سلوک کا مستحق تھا۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

# خُدا کی لاٹھی

(۱)

کہتے ہیں مظلوم کے خُون کا انتقام قُدرت لیتی ہے۔ جب امام حسین علیہ السلام شہید ہوئے۔ تو اُن کے خُون کا انتقام لینے والا کوئی جوان آلِ فاطمہؑ میں موجود نہ تھا۔ زین العابدین علیہ السلام بچہ تھے اور اس پر بیمار۔ باقی سب یزیدی لشکر کے ہاتھوں شہید ہو چکے۔ فاطمہؑ کی بہُو اور بیٹی بیکسی اور بے بسی کے عالم میں خون کے آنسو بہا رہی تھیں۔ شہر بانو اور زینبؑ لاکھ بے خوف اور بہادر ہوں۔ لیکن آخر عورت ذات تھیں اور پھر عزیزوں کی موت نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ بیچاری یزید کی جان کو روتی ہوئی یثرب کی طرف سدھاریں۔ لیکن ان کے

غم بے پایاں میں بھی اُمید کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ایک غیر انسانی طاقت ... ایک فوق الفطرت ہستی اُن کے پاکیزہ دلوں میں بیٹھی ہوئی یہ کہہ رہی تھی ... "آل نبیؐ! تسلی رکھ۔ حسینؑ کا خون رائیگاں نہیں جا سکتا۔ جلد یا بدیر خدا کا دستِ انصاف ضرور حرکت میں آئیگا"۔

زینبؑ رسولؐ کی نواسی تھیں۔ خود رسول نہ تھیں۔ لیکن اسی غیبی آواز نے اس کے لب و لہجہ میں وثوق اور تحکم پیدا کر دیا۔ جب وہ اپنے شہید بھائی کا سر گود میں لے کر یزید کے دربار سے رخصت ہوئیں۔ تو یہ الفاظ ان کی زبان پر تھے ... "ظالم! تُو نے اپنے احکام کی تعمیل دیکھ لی۔ لیکن ابھی قصہ ختم نہیں ہوا۔ خدائی احکام کی تعمیل دیکھنا باقی ہے۔ ہم کمزور و ناتوان سہی۔ لیکن ڈر اُس خدا سے جو انصاف کرنے والا ہے۔ اور خوف کھا اُس کے قہر سے جو تجھ جیسے ظالموں کو آنِ واحد میں پھونک سکتا ہے وہ وقت آ رہا ہے۔ جب تیرے بچے تیرے مُنہ پر اور میرے نانا کے نام کا کلمہ پڑھنے والے تیری قبر پر تھوکیں گے۔ اور خُدا کی لاٹھی بے گناہوں کے خون کا انتقام لے گی"۔

یزید میں رعونت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ اور بولا "کمزور عورت اپنے آپ کو بے بس پا کر گالیوں پر اُتر آتی ہے"۔

یزید ہنستا تھا۔ مگر اُس کی قسمت رو رہی تھی۔ اُس نے زینبؑ

کی آواز کو ایک ستم رسیدہ کی بد دُعا سمجھا۔ لیکن یہ ایک پیشنگوئی تھی جو حرف بہ حرف پُوری ہوئی۔ ایک کلمہ حق تھا۔ جسے مستقبل نے پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ؂

(۲)

اِس واقعہ کو کئی برس گزر گئے......

یزید.... دمشق کا ذی شوکت بادشاہ یزید۔ جس کے ایک اشارہ پر سینکڑوں انسانی زندگیاں تلف ہو جاتی تھیں۔ جس کی جنبش ابرو ہزاروں معصوم لڑکیوں کو بے عفت بنانے کے لئے کافی تھی... ایک اپاہج کی مانند شاہی محل کے ایک کمرے میں اپنے آخری سانس لے رہا تھا یا نہیں۔ بنو اُمیّہ کی عظمت و شوکت کا چراغ رفتہ رفتہ بجھتا جا رہا تھا۔ محل میں ہر طرف سناٹا تھا۔ ہاں۔ کبھی کبھی چند سسکیوں کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ یا بعض ملول و افسردہ رخساروں پر آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔ طبیب شاہی کا ہاتھ شاہی مریض کی نبض پر تھا اور آنکھیں آسمان کی طرف۔ گویا وہ اسے مایوس ہو کر دُعا کا سہارا لے رہا ہو!

یزید نے سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے رُک رُک کر کہا۔

"مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مجھے عافیت کے ساتھ مرنے دو۔ اُف.... کتنا شدید درد ہے...." ؂

یزید کی بیگم کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ گئے۔ اور اُس نے کہا۔
"یا خدا۔ میرے شوہر کو شفا دے۔ اِس عمر میں مجھے سوزِ بیوگی عطا نہ کر۔ ہم لاکھ گنہگار سہی لیکن تیرے بندے ہیں۔ اور تیرے رسولؐ کے کلمہ گو"۔
یہ کہتے کہتے بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور روتے روتے اس کی گھگی بندھ گئی۔ شاید اسے یقین ہو گیا۔ کہ خدا اُس کی فریاد نہ سُنے گا۔
یزید نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا "رونے دھونے سے کیا حاصل؟ میرا دل کہتا ہے۔ کہ اب میں نہ بچونگا۔ ایک آگ ہے۔ جو قلب جگر کو جلائے ڈالتی ہے۔ ذرا معاویہ کو بُلاؤ۔ میں اُسے کچھ نصیحتیں کروں گا"۔

معاویہ یزید کا نوجوان بیٹا تھا۔ اور تختِ دمشق کا وارث لیکن باپ بیٹے کے اطوار و عادات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یزید کو ظُلم پسند اور معاویہ کو مظلومی۔ خدا کی قدرت ایک ظالم باپ کے ہاں حق پسند بیٹا پیدا ہُوا۔ معاویہ نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی قریب المرگ باپ کو سلام کیا۔ اور کہا "ابّا میرے لئے کیا حُکم ہے"؟
یزید کی زبان بند ہو رہی تھی۔ لیکن اُس نے بیٹے کو دیکھنے کا اشارہ کیا۔ اور کہا "تو بنو اُمیّہ کی حکومت کا آیندہ مالک اور میرا جانشین ہے اس لئے چند نصائح سُن لے"۔

معاویہ ایک سعادتمند بیٹا تھا۔ لیکن اُس کے جواب نے باپ کو مایوس کر دیا۔ معاویہ بولا "ابا کوئی اور بات کیجئے۔ میں سیاسی پند و نصائح نہیں سُننا چاہتا"۔

یزید کے استعجاب کی حد نہ رہی۔ حیرت اور غصّہ کے ملے جُلے جذبات نے اُس پر غلبہ پا لیا۔ وہ درشت لہجہ میں بولا "کیوں؟"

معاویہ نے اپنے قلبی جوش کو دباتے ہوئے کہا "اگر آپ وجہ معلوم کرنا ہی چاہتے ہیں۔ تو سُن لیجئے۔ جس حکومت کی بُنیادیں آلِ رسولؐ کے خون اور فاطمہؑ کے جگر پاروں کی ہڈیوں پر رکھی گئی ہیں۔ اسے میرا دور سے ہی سلام۔ جس کو اپنی عاقبت بگاڑنے کا شوق ہو۔ وہ آپ کا جانشین بنے گا۔ خدا معاویہ کو اِس گناہوں کی گٹھڑی سے بچائے"۔

ماں سکتے میں آ گئی۔ باپ نے تڑپ کر کروٹ بدلی۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتا۔ معاویہ باہر جا چکا تھا۔

یزید کی حالت خراب ہونے لگی۔ تین دن تک منہ میں نہ نوالہ گیا نہ پانی کا قطرہ۔ جو شخص کل حسینؑ کی پیاس پر ہنستا تھا۔ آج خود پیاس کے مارے مرا جاتا تھا۔ جب آخری وقت قریب آیا۔ تو یزید نے کہا "بہت علیؑ نے کہا تھا۔ خدا کی لاٹھی تجھ سے انتقام لے گی۔ پیاسے حسینؑ کا قاتل آج خود دُنیا سے پیاسا جا رہا ہے۔ اُف... پانی... پانی..."

یہ کہتے کہتے یزید نے دم توڑا۔ یہ خدا کی لاٹھی کا پہلا وار تھا۔

(۳)

رات کی تاریکی میں ایک قیدی جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور جسم پر جابجا چوٹوں کے نشان تھے جیلخانہ کی دیوار پھاند کر ایک سمت کو بھاگا۔

دن بدلتے دیر نہیں۔ جو شہنشاہ تھا۔ اُسے آج ہم در بدر بھیک مانگتے دیکھتے ہیں۔ اور جو کل گدا تھا۔ اُسے تختِ زرّیں پر فروکش پاتے ہیں۔ عبید ایک قیدی تھا۔ لیکن قُدرت نے اسے حکومت دے دی۔ چند دن کے بعد وہ کُوفہ کا حاکم تھا۔ یہ کیسے اور کیونکر ہُوا؟ اِس سوال کا جواب دینا انسان کا کام نہیں۔ جو مشیّتِ ایزدی آناً فاناً بستیوں میں صحرا اور جنگل میں منگل کر دیتی ہے۔ وہی اپنے اسرارِ نہاں پر روشنی ڈال سکتی ہے۔ خدا کی شان۔ ایک مجرم۔ ایک قیدی۔ ایک قانون شکن کُوفہ کی قسمت کا مالک بنا ہُوا تھا۔ اور دُنیا والے اِس بات سے قطعاً بے خبر تھے۔ کہ وہ انسان ہے یا فرشتہ۔ جنّ ہے یا دیو۔ امورِ قُدرت میں کِس کو دخل ہو سکتا ہے؟

عبید نے جو مختار کے لقب سے مشہور تھا۔ کُوفہ پر تسلّط جماتے ہی مندرجہ ذیل اعلان کیا:۔

"یا معاشر العرب! قسم ہے رسولِ پاک کی۔ میں سید الشہدائ کے خون کا بدلہ لونگا۔ لعنت ہو ایسے مسلمانوں پر جنہوں نے پیغمبر آخرالزمان کی اولاد کو بے زبان حیوانوں کی طرح ذبح کیا۔ کوفہ والوں نے امام حسینؑ کو اپنے گھر بلا کر اُن کی جان لی مہمان کو اپنے ہاتھوں شہید کیا۔ اور یہ معاشرت عرب میں ایک ایسا جرم ہے۔ جس کے لئے کوئی عفو نہیں میں نے عہد کیا ہے۔ کہ جب تک قاتلان حسینؑ کیفر کردار کو نہ پہنچ جائیں اپنی تلوار میان میں نہ رکھوں گا۔ عام رعایا سے مجھے کوئی پرخاش نہیں۔ لیکن اگر اہلِ کوفہ آکر اپنے شہر میں خون کے دریا بہتے نہیں دیکھنا چاہتے۔ تو اُن لوگوں کو فی الفور حاضر کردیں۔ جنہوں نے آلِ رسولؐ کے خلاف تلوار اُٹھائی تھی۔ اگر میرے حکم کی تعمیل نہ ہوئی۔ تو یاد رکھو۔ کہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا"۔

کوفہ میں دہشت طاری ہوگئی۔ جو لوگ امام حسین علیہ السلام اور اُن کے عزیزوں کے قتل پر شیخیاں بگھارتے تھے۔ اور اپنے افعالِ قبیحہ کو شجاعت پر محمول کرتے تھے۔ وہ جان کے خوف سے تھر تھر کانپنے لگے جو آنکھیں خاندانِ رسول صلعم کی بہو بیٹیوں کی تذلیل پر مسکراتی تھیں۔ وہ اپنی مستورات کی بے عزتی کے خوف سے آنسو بہانے لگیں۔ جن بازوؤں نے نہایت لاپروائی سے

کلمہ گویان حق کی گردن پر شجاعانہ انداز میں تلوار رکھ دی تھی! اُن میں لرزہ پیدا ہو گیا۔ اور جن زبانوں نے یزید کے حکم سے بنو فاطمہؑ کا خون پیا تھا۔ اُن پر مُہر سکوت لگ گئی۔ انسانوں کو اپنی زندگی کتنی پیاری ہوتی ہے!

باغیان رسالت کے قتل عام کا حکم ہوا۔ قیدی گروہ در گروہ مختار کے سامنے لائے گئے۔ اور سجدہ میں گر کر مختار سے جاں بخشی کی استدعا کرنے لگے۔ مختار نے کڑکڑاتی ہوئی آواز میں کہا "بزدلو تمہاری شجاعت کیا ہوئی۔ کیا تمہاری دلیری پیاسوں اور بے گناہوں کے گلے پر خنجر چلانے تک ہی محدود تھی؟ اب اپنی جان پر بنی ہے۔ تو روتے کیوں ہیں؟ مَیں سچ کہتا ہُوں۔ میری آتش انتقام اُس وقت تک فرو نہیں ہو سکتی۔ جب تک کُوفہ... اس کُفار کی بستی میں ایک متنفس بھی زندہ ہے"۔

خُدا کی لاٹھی چلنے لگی حتیٰ کہ مختار کا دربار انسانی کھوپڑیوں سے پٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا سارا کُوفہ مقتولین کے خون اور بیواؤں کے آنسوؤں میں تحلیل ہو کر رہ جائیگا... قدرت کا انتقام کتنا خوفناک ہے!

(۴)

مختار صبح سے دربار میں کھڑا قتل کے احکام نافذ کر رہا تھا۔ شام

ہونے کو آئی۔ لیکن کوفہ کے مصائب ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ شام کی نماز کے وقت سرداروں نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ لیکن مختار کی آتشِ انتقام ابھی ٹھنڈی نہ ہوئی تھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے مسجد میں ہی اعلان کیا۔ "اے سردارو! جب تک تم عمرو بن سعد، شمر اور خولی کو زندہ نہ پکڑ لاؤ۔ کھانا اور سونا تم پر حرام ہے"۔

پکڑ دھکڑ رات کو بھی جاری رہی۔ یہ شب اہل کوفہ کے لئے قیامت کی رات تھی۔ مختار کے ڈر سے لوگ روتے بھی نہ تھے۔ مبادا پکڑے جائیں اور ہیرو دربار جان سے ہاتھ دھوئیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور شہر پر قبرستان کا گمان ہوتا تھا۔

مختار کے نائب اپنی دُھن کے پکے تھے۔ جب آفتاب کی پہلی شعاع نمودار ہوئی۔ تو وہ اُن تین بدنصیبوں کو پابجولاں دربار میں لے آئے۔ جن کے ناپاک ہاتھ آلِ رسولؐ کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ مختار جن کے ناپاک ہاتھ آلِ رسولؐ کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ مختار بیسویں صدی کے قانون نہ پڑھا تھا۔ اُس نے اُن ملعونوں کو باری باری اُن کی تقصیریں بتائیں۔ اُس نے عمرو بن سعد سے کہا۔ "ظالم یزید کے خونخوار درندے! قتل امام ... نہیں قتلِ اسلام کا سہرا تیرے سر ہے تیرے حکم سے بنو فاطمہؓ شہید کئے گئے۔ بتا۔ تو اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے؟"

عمرؔ۔۔۔ وہ سپہ سالار جس نے علی اصغرؑ جیسے شیر خوار بچّے کو پانی کی بجائے جامِ مرگ پلایا۔ مختار کے سامنے گڑگڑانے لگا۔ اور بولا۔ "خُدا کی قسم یہ گُناہ یزید کے سر پر ہے"۔

مُختار کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ ایشیا کا۔۔۔ نہیں دُنیا کا ظالم ترین شخص اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ فرطِ غضب سے مختار کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اُس نے ایک سردار کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اور دوسرے لمحہ ہی کربلا کے قاتلِ اعظم کی لاش خاک و خُون میں لوٹنے لگی۔ اِس کے بعد شمر کی باری آئی۔ وہ شخص جس نے دریائے فرات پر قبضہ کر لیا تھا۔ اِس لئے کہ خاندانِ رسالت اپنی پیاس نہ بُجھا سکے۔ موت کو سامنے دیکھ کر کانپنے لگا۔ گلا خُشک ہو گیا۔ اور اس نے نہایت بیکسانہ انداز میں کہا۔ "مختار ایک گھونٹ پانی۔۔۔ اس کے بعد مجھے بیشک مار ڈالنا"۔

مختار ہنسا۔ ٹھیک اِسی طرح جیسے شمر جنگ کربلا میں سیّد زادوں کو پانی کے لئے بلکتے دیکھ کر ہنستا تھا۔ اُس نے اپنے سردار سے کہا۔ "اِس کو آبِ تیغ پلاؤ"۔ شمر ختم ہُوا۔ اور اس کے بعد زخمی حسینؑ کے سینہ پر چڑھ کر اُن کا سرِ مبارک تن سے جُدا کرنے والا خولی بھی۔ بنواُمیّہ رو رہے تھے۔ لیکن قُدرت ہنس رہی تھی۔ قدرت کا

انتقام ہنس رہا تھا۔ خُدا کا انصاف ہنس رہا تھا ؂

اِس واقعہ کو سینکڑوں برس گزُر گئے۔ مُختار جس بستی سے اُٹھا تھا اُسی میں غائب ہو گیا۔ لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ اس کے جاتے ہی خدا کی لاٹھی بھی تھم گئی۔ لیکن مجھے اب بھی اُس کی حرکت دکھائی دیتی ہے۔ کیا آج بھی کروڑوں مسلمان یزید کے نام پر لعنت نہیں بھیجتے۔ کیا آج عمر و سعد۔ شمر اور خولی کا نام نفرت و حقارت سے نہیں لیا جاتا؟ امام حسینؓ شہید ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندہ ہیں۔ یزید آج روز مرتا ہے یقین نہ ہو۔ تو اپنے دِلوں کو ٹٹولو۔ اُس کی مرگِ پیہم بتاتی ہے۔ کہ خدا کی لاٹھی بدستور چل رہی ہے ؂

تمت

## شیعہ بچّوں کے لئے

# دینی کُتب کا سلسلہ

ہم نے مندرجہ ذیل کتابیں شیعہ بچّوں کے لئے خاص طور پر تیار کرائی ہیں۔ یہ سلسلہ کم عُمر بچّوں اور بچّیوں کی تعلیم کے لئے بہت ہی مفید ہے اور ہم امید کرتے ہیں۔ کہ اس سلسلہ کی پانچوں کتابوں کے مطالعہ کرنے کے بعد مسائل دینیہ کے لئے کسی کتاب کی ضرورت نہ رہے گی۔

| دینیات کی پہلی | دُوسری | تیسری | چوتھی | پانچویں |
| --- | --- | --- | --- | --- |
| ۴ر | ۵ر | ۶ر | ۱۰ر | عہ ر |

ملنے کا پتہ

### مینجر کتب خانہ اثنا عشری (رجسٹرڈ) لاہور

موچی دروازہ مُغل حویلی

# سیدِ الاوصیاء

یعنی

سوانح حیات جناب امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ

مُصنّفہ

جناب مولانا مولوی عارف حسین صاحب قبلہ

اِس میں جناب مولائے مومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام امام اوّل کی تمام زندگی از پیدائش تا شہادت کے حالات درج ہیں۔ قابلِ دید کتاب ہے۔

قیمت صرف ۳ مجلد ولایتی ڈائی دار سنہری ۱۲

ملنے کا پتہ:- منیجر کتب خانہ اثنا عشری (رجسٹرڈ) لاہور مغل حویلی